اسلامی علوم وتحقیقات اور زبان وادب کا ترجمان ماہنامہ

جلد: ۰۴، شمارہ: ۰۶ شعبان/ رمضان ۱۴۴۳ھ، مارچ/ اپریل ۲۰۲۲ء

النخیل کراچی

بانی

ابن الحسن عباسی رحمۃ اللہ علیہ

اسلامی علوم وتحقیقات اور زبان وادب کا ترجمان ماہنامہ

النخیل

جلد: ۰۴، شمارہ: ۰۶، شعبان/ رمضان ۱۴۴۳ھ، مارچ/ اپریل ۲۰۲۲ء

ادارہ تراث الادب

alnakhil786@gmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فی شمارہ:.... 60روپے　**سالانہ زرِ تعاون** :.... 600 روپے

خط وکتابت کا پتہ:.....ادارہ تراث الادب، ۰۷/دس آر، آریہ نگر، خانیوال

رابطہ نمبر:.......... 03004097744-03444023470

ای میل ایڈریس: alnakhil786@gmail.com

صدائے نخیل

نیکیوں کا موسم بہار

مدیر کے قلم سے

بحمد اللہ رمضان کا مبارک و مقدس مہینا ایک بار پھر ہمارے سروں پر سایہ فگن ہونے والا ہے۔ رمضان کو اسلامی مہینوں میں ایک خاص تقدس اور احترام حاصل ہے۔ اس مہینے کے دوران پورا عالم اسلام تقدس، رحمت، برکت اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کے مخصوص نورانی ماحول میں ڈوب جاتا ہے۔ اسلام کی اقدار و روایات میں رمضان مغفرت اور بخشش کا مہینا ہے، اس مہینے میں دنیا بھر کے مسلمان پورے سال کے دوران اللہ تعالیٰ کی عبادت اور بندگی کے فرائض و حقوق بجالانے میں ہونے والی کمیوں، کوتاہیوں اور غفلتوں کی تلافی اور ازالے میں کوشاں ہوتے ہیں اور ہر پیر و جوان ایک خاص ذوق، شوق اور اخلاص و جذبے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں جت جاتا ہے۔ رمضان ہمیں اطاعت و فرمانبرداری کے جذبات کو غالب کر کے رحمتیں اور برکتیں سمیٹنے کا سنہری موقع عطا کرتا ہے۔ اس ربانی اہتمام اور اللہ تعالیٰ کی خصوصی نظرِ رحمت کے طفیل رمضان میں اطاعت و عبادت کا رجحان اور میلان فضا میں چھا جاتا ہے اور دنیا بھر کے مسلمان یکسوئی اور دلجمعی کے ساتھ رمضان کی برکتوں سے حسبِ توفیق بہرہ ور ہوتے ہیں۔ مسلم سماج میں ابتدا سے ہی یہ قدر رائج رہی ہے کہ رمضان میں مساجد اور دینی مراکز میں اس بات کا خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے کہ رمضان کی مناسبت سے خصوصی دینی تربیت دی جائے، عوام کو روحانی و دینی غذا فراہم کی جائے اور لوگوں کو دینی تعلیمات کے متعلق زیادہ سے زیادہ آگہی دی جائے۔

یہ امر محتاج بیاں نہیں کہ رمضان ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ ہم دردی، غم خواری، ایثار نفس، تواضع و خاکساری، برداشت و تحمل، صبر و درگزر اور صدق و امانت سے پیش آنے کا درس دیتا ہے۔

غور کیا جائے تو انہی اوصافِ حسنہ کی غیر معمولی کمی نے معاشرے کو انتشار سے دوچار کر رکھا ہے۔ من حیث القوم ہم خود غرضی، انانیت، تکبر و غرور، دھوکا و فریب، جعل سازی و ملاوٹ، ذخیرہ اندوزی و زر اندوزی، ناجائز منافع خوری اور استحصال کے بھنور میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ان قباحتوں نے طبقاتی تفریق کی لکیر کو گہرا کر دیا ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ماہِ مبارک کی آمد کے ساتھ ہی ہمارے معاشرے میں معاملات کے شعبے میں پائی جانی والی وہ خرابیاں کھل کر سامنے آجاتی ہیں جو بہت سے اہل نظر کے نزدیک مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالی کا بڑا سبب ہیں۔ رمضان کی آمد پر ایک بار پھر ملک میں مہنگائی میں ہوشربا اضافہ اس کا ایک تازہ مظہر ہے۔ رمضان میں مہنگائی کے جن پر قابو پانے میں نہ ہماری حکومتیں کامیاب ہو پاتی ہیں نہ ہماری تاجر برادری کو غریب عوام کا کچھ احساس ہوتا ہے۔ عوام الناس ہر سال رمضان المبارک میں ریلیف کے خواہش مند ہوتے ہیں، تاہم حکمرانوں کی جانب سے برائے نام پیکج کا اجرا آٹے میں نمک کے برابر ثابت ہوتا ہے اور ملک کا بہت بڑا طبقہ اس مقدس مہینے کی بابرکت ساعتوں میں بھی نان جویں کے انتظام کے لیے گوناگوں مشکلات اور پریشانیوں کا شکار دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح ہماری تاجر برادری بھی (الا ماشاء اللہ) رمضان میں عام آدمی کو کچھ رعایت یا ریلیف دینی کی بجائے دونوں ہاتھوں سے لوٹنے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ مثال عام طور پر بیان کی جاتی ہے کہ مغرب میں سالانہ تہواروں کے موقع پر حکومت و ریاست کی طرف سے عوام کے لیے خاص امدادی اور رعایتی سہولیات فراہم کی جاتی ہیں، جس کے نتیجے میں معاشرے کے غریب اور نادار طبقات بھی مذہبی اور سماجی ایام میں بھرپور طریقے سے شرکت کرتے اور ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس مملکت خداداد کا قیام اسلام کے نام پر عمل میں لایا گیا، لیکن صد حسرت وافسوس کے آج یہاں اسلامی تعلیمات واخلاقیات کے سوا سب کچھ موجود ہے۔ ہمیں اپنے آپ کو بہر حال بدلنا ہوگا اور اس رمضان کی بابرکت ساعتوں میں مذکورہ برائیوں کو ترک کرنے بلکہ ان سے لڑنے کا عزم کرنا ہوگا۔ کورونا وبا کی آزمائش سے نکلنے کے لیے بھی ہمیں اپنے اعمال کو درست کرنا ہوگا اور خاص طور پر رمضان کے مقدس مہینے میں حرص مال کے فتنے سے بچنا ہوگا۔

کچھ عرصے سے رمضان المبارک میں رمضان ٹرانسمیشن کے عنوان سے نجی ٹی وی چینلوں نے ایسے میلے سجانا شروع کر دیے ہیں، جو رمضان المبارک کے تقدس کے ہی نہیں، سراسر اسلامی تعلیمات کی روح کے بھی منافی ہیں۔ رمضان المبارک کو اسلامی مہینوں میں ایک خاص تقدس اور احترام حاصل ہے۔ اس مہینے کے دوران پورا عالم اسلام تقدس، رحمت، برکت اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کے مخصوص نورانی ماحول میں ڈوب جاتا ہے۔ ہر پیر و جوان ایک خاص ذوق، شوق اور اخلاص و جذبے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں جت جاتا ہے۔ نفسانی تقاضے اور شیطان سال بھر انسان کی راہ کھوٹی کرتے رہتے ہیں، جس سے خدا اور بندے کے تعلق میں ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ رمضان کے مبارک مہینے میں اللہ تعالیٰ خصوصی فضل و کرم سے اطاعت و فرمانبرداری کے جذبات کو غالب کر کے رحمتیں اور برکتیں سمیٹنے کا سنہری موقع عطا کرتا ہے۔ دینی روایات کے مطابق اس مہینے میں بدی کے انسان دشمن کردار شیطان کو جکڑ دیا جاتا ہے، جبکہ نفس کے منفی جذبات، سرکشی اور طغیانی کو کنٹرول کرنے کے لیے روزوں کی صورت میں عملی تربیتی کورس رکھا گیا ہے۔ اس ربانی اہتمام اور اللہ تعالیٰ کی خصوصی نظرِ رحمت کے طفیل رمضان میں اطاعت و عبادت کا رجحان اور میلان فضا میں چھا جاتا ہے اور دنیا بھر کے مسلمان یکسوئی اور دلجمعی کے ساتھ رمضان کی برکتوں سے حسبِ توفیق بہرہ ور ہوتے ہیں۔

مسلم معاشرہ میں ابتدا سے ہی یہ قدر رائج رہی ہے کہ رمضان المبارک میں دینی ادارے، مراکز اور مساجد میں اس بات کا خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے کہ رمضان کی مناسبت سے عوام کی خصوصی دینی تربیت کی جائے، عوام کو روحانی و دینی غذا فراہم کی جائے اور لوگوں کو دینی تعلیمات کے متعلق زیادہ سے زیادہ آگہی دی جائے۔ اس مقصد کے لیے ابلاغ کے تمام رائج اور مناسب ذرائع و وسائل بروئے کار لائے جاتے ہیں۔ ٹی وی چینلز عصرِ حاضر میں ابلاغ و اطلاعات کا سب سے اہم اور موثر ذریعہ سمجھے جاتے ہیں۔ پاکستان سے باہر مسلم دنیا کے دیگر حصوں میں رمضان المبارک کی مناسبت سے جہاں مساجد اور دیگر دینی مراکز میں دین کی خصوصی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہوتا ہے، وہاں ٹی وی چینلوں پر بھی دینی آگہی اور اسلامی تعلیمات و تاریخ کے

بارے میں خصوصی پروگرام کیے جاتے ہیں۔اس کے برعکس پاکستان میں جب سے پرائیویٹ ٹی وی چینلوں کا کاروبار گرم ہوگیا ہے، رمضان، دین، روحانیت سمیت ہر چیز کو جنسِ بازار بنا کر زراندوزی کی غرض سے کاروبار بنادیا گیا ہے اور کاروبار کے بازاری تقاضوں کے مطابق ہی ان موضوعات کے ساتھ سلوک روا رکھا جاتا ہے۔

کہنے کو تو پاکستان میں احترامِ رمضان کے لیے باقاعدہ قوانین موجود ہیں، تاہم ٹی وی چینل ان قوانین سمیت رمضان المبارک کے احترام اور تقدس کی دھجیاں اڑاتے ہوئے ایسے ایسے لچر پروگرام رمضان ٹرانسمیشن کی آڑ میں پیش کرتے ہیں کہ الامان والحفیظ۔ اس مارکیٹ میں یہ بے اصولی، اصول کے طور پر راہ پا گئی ہے کہ جو دِکھتا ہے، وہ بِکتا ہے، چنانچہ اس برخود غلط نظریے کے تحت ٹی وی چینل اپنی ریٹنگ بڑھانے کے لیے، بجائے دین اور شریعت کے ماہرین کو رمضان ٹرانسمیشنز میں مدعو کرنے کے، فلموں کے معروف چہروں کا انتخاب کرتے ہیں، جو اسلام اور اسلامی تعلیمات کی "الف"، "ب" سے بھی واقف نہیں ہوتے۔ یہ لوگ "تفریح" (انٹرٹینمنٹ) کے شعبے سے تعلق رکھتے ہیں، پورا سال "تفریح" کے شعبدے دکھا کر روزی کماتے ہیں اور اپنے اس خاص شعبے کے سوا اور کسی شعبے کے متعلق معلومات نہیں رکھتے، چنانچہ رمضان ٹرانسمیشنز کو بھی یہ "تفریح" بنا کر رکھتے ہیں۔ یہ دین اور رمضان کے شایانِ شان عبادت کے لیے سازگار ماحول اور اسلامی قدروں کے یکسر منافی عمل ہے۔

وفاقی وزیر مذہبی امور پیر نور الحق قادری نے وزیر اعظم عمران خان کے نام ایک خط میں بجا طور پر اس طرح کے پروگراموں پر پابندی لگانے کی سفارش کی ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ حکومت کو اس سفارش پر عمل کرنا چاہیے اور ٹی وی چینلوں پر رمضان نشریات کے نام پر دینی شعائر کے ساتھ کھلواڑ کا سلسلہ بند ہونا چاہیے۔۔۔اللہ تعالیٰ ہمارا حامی وناصر ہو۔

محمد شفیع چترالی

۱۷ شعبان المعظم ۱۴۴۳ھ

☆......☆......☆

سوزِ دل

علاج اس کا بھی اے چارہ گراں

مولانا ابن الحسن عباسیؒ

گزشتہ چند صدیوں سے اقتصادی، سائنسی اور صنعتی ترقی کی جو بین الاقوامی دوڑ شروع ہوئی ہے ہم اس میں بہت پیچھے ہیں۔ ہم صدیوں آگے تھے اور اب برسوں پیچھے چلے گئے ہیں، ہمارے زوال وانحطاط کے ان گنت اسباب ہیں۔ عالم اسلام کو تو رہنے دیں، خود ہمارا ملک قدرتی وسائل سے مالا مال ہے، زرخیز زمینیں ہیں، لہلہاتی وادیاں ہیں، بہتے دریا اور ابلتے چشمے ہیں، گلیشرز اور سرسبز پہاڑ ہیں، معتدل آب وہوا ہے، لوگوں میں محنت کرنے اور مشقت اٹھانے کی صلاحیت بھی ہے، اس سب کے باوجود ترقی کا سفر بہت سست ہے، مہینوں کا سفر سالوں میں طے ہو رہا ہے، کئی رکاوٹیں اور قابل اصلاح امور ہیں، ان میں ہمارا ایک اہم مسئلہ قومی مزاج کی اصلاح کا بھی ہے۔ من حیث القوم ہمارے اندر کچھ ایسی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں جن کی اصلاح کے بغیر ہم ترقی کی منزلیں طے نہیں کر سکتے۔

کوئی دکان بناتا ہے تو اسے اپنی دکان کی جائز حدود پر قناعت نہیں ہوتی اور وہ سائن بورڈ اور اشیاء خرید وفروخت اٹھا کر فٹ پاتھ یا سڑک پر رکھ دیتا ہے، اسے یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ جس جگہ کو اس نے اپنی دکان کا حصہ بنایا وہ قوم کی مشترکہ گزرگاہ ہے، اس کی دکان کا حصہ نہیں، اس کو صرف اپنی دکان سے دلچسپی ہے، قوم پر اس کے اس عمل سے کیا گزرتی ہے، اس کو اس کی کوئی پروا نہیں۔

قومی پارک بنائے جاتے ہیں تو ایک مہذب معاشرے کا سا سلوک وہاں نظر نہیں آتا، اس کے گملے ہم توڑ دیتے ہیں، اس کی گھاس نکال دیتے ہیں، اس کے بینچ اکھیڑ دیتے ہیں، اس کے ڈسٹ بن یا ٹوٹے ہوئے ہوتے ہیں اور اگر اکّا دکّا صحیح سالم ہو تو کچرا باہر اور کچرا دان خالی ہوتا ہے، ایک جوس

پینے والا اتنی زحمت بھی گوارا نہیں کرتا کہ اس کا ڈبہ کچرادان میں جا کر ڈال دے، وہ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے یا تو وہیں سے کچرادان کا نشانہ لے گا جو اکثر اوقات ہدف تک نہیں پہنچ پاتا اور یا جہاں بیٹھا ہے وہیں خالی ڈبہ پھینک دے گا، اس کو اس بات کی قطعی پروا نہیں کہ اس کی اس حرکت سے ایک مشترکہ قومی ملکیت کی خوب صورتی متاثر ہوتی ہے اور اس طرح کرنا اس کے لئے جائز نہیں۔ اس کی دیواروں اور شفاف فرش پر کہیں پان کے دھبوں کی سرخی، کہیں نسوار کا سبزہ اور کہیں سگریٹ کی خاکستر ہمارے بگڑے ہوئے قومی مزاج کا پتہ دیتی ہے۔ کہیں ہمیں کوئی دیوار صاف وشفاف نظر آ جائے تو مختلف اشتہارات کے لئے نظر انتخاب اس پر ٹھہر جاتی ہے اور کچھ عرصہ بعد وہاں اشتہارات کے اتوار بازار کا سماں ہوتا ہے، اشتہار لگانے والوں کے دل میں یہ احساس نہیں ہوتا کہ اس طرح کسی کی ملکیت میں تصرف کرنا اور اسے تشہیر کے لئے استعمال کرنا جائز نہیں۔

بجلی، گیس، پانی میں ہمارا ملک اب تک قلت کا شکار ہے، کئی دیہات، شہر اور کچی آبادیاں ان سہولتوں سے محروم ہیں لیکن دوسری طرف شہر کی سڑکوں، سرکاری عمارتوں اور دفتروں میں اس کی بے تحاشا فراوانی کر دی گئی ہے کہ بسا اوقات صبح نو دس بجے تک سرچ لائٹیں روشن رہتی ہیں، دفاتر کے خالی کمروں میں بلب روشن اور پنکھے چل رہے ہوتے ہیں اور یہ سب اس حضور کے نام لیوا کر رہے ہیں جن کا ارشاد ہے کہ: ’’پانی کے فضول استعمال کرنے سے بچو خواہ تم کسی بہتے ہوئے دریا کے پاس کھڑے ہو!‘‘

سرکاری اسکول اور ہسپتال قوم کا مشترکہ سرمایہ ہیں، ان میں بھی یہی مزاج نمایاں ہے۔ سرکاری اسکول کی دیواروں، فرش، کرسیوں اور ڈیسک ایک ایک چیز سے ویرانی ٹپکتی ہے، اساتذہ حکومت سے بھرپور تنخواہ اور مراعات لیتے ہیں لیکن پڑھانے کے لئے ہفتہ میں ایک آدھ بار ہی چکر لگاتے ہیں، حاضری لگا کر دوسرے ذاتی کاموں میں لگ جاتے ہیں یا پرائیوٹ اداروں میں کام کرنے چلے جاتے ہیں، وہ سرکاری اسکولوں سے پیسہ کما کر اپنے بچوں کو پرائیوٹ اسکولوں میں پڑھاتے ہیں۔

سرکاری ہسپتال ناقص نظام اور غفلت کی وجہ سے موت کی آماجگاہ ہیں، اس کے ناقص نظام سے بھی مریض یا سفارش کے ذریعہ فائدہ اٹھاتا ہے یا تعلق کی بناء پر، نادار مریضوں کے لئے جو مفت ادویہ فراہم کی جاتی ہیں، ہسپتال کا کرپٹ عملہ اسے میڈیکل اسٹوروں میں فروخت کر دیتا ہے اور ڈاکٹر

اپنے نام کے ساتھ سرکاری ہسپتال کے سرجن ہونے کی تختی لگا کر پرائیوٹ کلینک چمکانے کی تگ ودو میں لگے رہتے ہیں، انہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ ملازمت کے اوقات وہ قوم کے ہاتھ فروخت کر چکے ہیں اور ان اوقات کو کسی دوسرے کام میں لگانا درست نہیں۔

منصوبہ سازی میں نقص نہیں، اصل مسئلہ منصوبے کو عملی جامہ پہنانے اور اس سے مہذب طریقہ سے فائدہ اٹھانے میں ہمارے بگڑے ہوئے قومی مزاج کے آڑے آنے کا ہے، مثلاً بیس کروڑ کی رقم سے کسی سڑک، کسی اسکول، کسی ہسپتال اور کسی پارک کا تعمیری منصوبہ مکمل ہو بھی جائے لیکن جب تک ان مشترکہ قومی املاک سے صحیح اور جائز طریقۂ استعمال کا قومی مزاج افراد میں پیدا نہ ہو، قوم اس سہولت سے کما حقہ فائدہ نہیں اٹھا سکتی۔

زندگی کا وہ کون سا شعبہ ہے جس میں ہمارے دین نے ہمیں زریں تعلیمات وہدایات نہ دی ہوں۔ کامل مسلمان اس کو قرار دیا گیا ہے جس کے شر سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں، اس کی زبان کا خنجر کسی کو گھائل نہ کرتا ہو، اس کے ہاتھ کی حرکت کسی کی اذیت کا سبب نہ بنتی ہو اور اس کے کسی عمل اور کسی ادا سے کوئی مسلمان تکلیف میں مبتلا نہ ہوتا ہو۔ دین اسلام تو نام ہی سراپا خیر خواہی کا ہے، کسی شاہراہ، کسی راستے اور کسی گزرگاہ میں پڑی تکلیف دہ چیز کو اٹھانا ایمان کا شعبہ اور تقاضا قرار دیا گیا ہے، کانٹے بچھانے نہیں، اٹھانے کا حکم دیا گیا ہے، جو اپنے لئے پسند ہو، دوسروں کے لئے وہی چاہنا ایک حقیقی مؤمن کا وصف ہے اور اس وصف کے بغیر کوئی کامل مؤمن بن نہیں سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک حقیقی اسلامی معاشرہ ناہموار رویوں کا کبھی شکار نہیں ہو سکتا، ہماری ترقی کی راہ میں صرف وسائل کی کمی رکاوٹ نہیں بلکہ وسائل کا صحیح استعمال اور من حیث القوم ان سے فائدہ اٹھانے کے لئے درست تربیت کا فقدان بھی ہماری ترقی میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ یہ تربیت ہمیں اسلام نے فراہم کی ہے اور اس قدر اعلیٰ طریقے سے فراہم کی ہے کہ اس سے بہتر کا انسان تصور بھی نہیں کر سکتا لیکن ہم نے اسلام کی وہ اعلیٰ تربیت تیاگ دی ہے، نتیجتاً ہمارے قومی مزاج میں بگاڑ آ گیا اور یہی بگڑا ہوا مزاج ہماری ترقی کے لئے سد راہ ہے: علاج اس کا بھی اے چارہ گراں ہے کہ نہیں

(انتخاب از قلم نما)

ماہ وسال

شب قدر

ماہِ رمضان کے انوار وبرکات کی بے مثال رات

مولانا محمد اسلام قاسمی
استاذ حدیث وادب دارالعلوم وقف دیوبند

رمضان المبارک کا پورا مہینہ ایک نعمت الٰہی ہے جس میں بندہ آخرت کی دولت کماتا ہے، یہ مبارک مہینہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی جانب سے مومن بندوں کے لیے ایک عطیہ ہے، دن کو صیام (روزہ) اور رات کو قیام (تراویح) کے ذریعہ انسان اپنے گذشتہ تمام گناہ صغیرہ معاف کرالیتا ہے، اس کے علاوہ عبادت کی دوسری تمام صورتیں اپنا کر نیکی کو ستّر گنا اضافہ کے ساتھ حاصل کرلیتا ہے، جیسا کہ صحیح روایات سے ثابت ہے۔

مگر اس مہینے کے آخری عشرے (دس دن) میں مزید فضیلتیں بھی شامل ہوجاتی ہیں، چنانچہ مسلم شریف کی ایک روایت ہے کہ محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری دس دنوں کے اندر جتنی محنت سے عبادت کرتے تھے اس کے علاوہ دوسرے دنوں میں اتنی محنت نہیں کرتے تھے۔

بخاری ومسلم کی ایک روایت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے جس کا مفہوم یہی ہے کہ جب رمضان کا آخری عشرہ آتا تھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکمل طور پر رات بھر عبادت کے لیے تیار ہوجاتے تھے اور اپنے گھر والوں کو بھی عبادت کے لیے جگاتے تھے۔

اس عشرے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں اعتکاف مسنون کیا جاتا ہے، لوگ یکسو ہوکر

مسجد ہی میں جاگزیں ہوتے ہیں اور ختم رمضان تک اعتکاف کرتے ہیں، ہمہ وقت مسجد میں اور وہ بھی عبادت میں گذارا جاتا ہے۔

مگر ان آخری دس دنوں کی سب سے نمایاں اور بڑی فضیلت یہ ہے کہ اس میں ایک مبارک رات ایسی آتی ہے جسے لیلۃ القدر (شب قدر) کہتے ہیں، اس رات کی خصوصیات اور فضائل کیا ہیں اس کے لیے ہمیں پوری وضاحت قرآن کریم سے حاصل ہوجاتی ہے، اس عظیم ترین رات کی اہمیت، برکت اور فضیلت کے بیان میں قرآن کریم کی مکمل ایک سورت ہی نازل ہوگئی ہے:

إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ، وَمَا أَدْرَاكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ، لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ، تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِم مِّن كُلِّ أَمْرٍ، سَلَامٌ هِيَ حَتَّىٰ مَطْلَعِ الْفَجْرِ

ترجمہ: بے شک ہم نے قرآن کو شب قدر میں اتارا ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ شب قدر کیسی چیز ہے، شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے، اس رات میں فرشتے اور روح القدس (جبرئیل علیہ السلام) اپنے پروردگار کے حکم سے ہر امر خیر کو لے کر اترتے ہیں، سراپا سلام وامان ہے، وہ رات طلوع فجر (یعنی صبح صادق) تک رہتی ہے۔

اس سورت میں شب قدر کی چار خصوصیات کا ذکر ہے، جس کو ہم آئندہ تحریر میں وضاحت سے پیش کریں گے۔

لیلۃ القدر کا مفہوم: قدر کے ایک معنی عظمت وشرف کے ہیں، زہری وغیرہ حضرات علماء نے اس جگہ یہی معنی لیے ہیں اور اس رات کو لیلۃ القدر کہنے کی وجہ اس رات کی عظمت وشرف ہے، اور ابوبکر ورّاق نے فرمایا کہ اس رات کو لیلۃ القدر اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ جس آدمی کی اس سے پہلے اپنی بے عملی کے سبب کوئی قدر وقیمت نہ تھی اس رات میں توبہ واستغفار اور عبادت کے ذریعہ وہ صاحب قدر و شرف بن جاتا ہے۔ (معارف القرآن ج ۸)

دراصل یہ رات اپنی خصوصیات کی وجہ سے بھی عظیم وقابل شرف وعزت ہے، اس لیے اس کو شب قدر سے تعبیر کیا گیا ہے۔

قدر کے دوسرے معنی تقدیر وحکم کے بھی آتے ہیں، حضرت مفتی محمد شفیع دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ نے

اپنی تفسیر معارف القرآن میں اس معنی کی وضاحت میں لکھا ہے: ''لیلۃ القدر کہنے کی وجہ یہ ہوئی کہ اس رات میں تمام مخلوقات کے لیے جو کچھ تقدیر ازلی میں لکھا ہوا ہے اس کا وہ حصہ جو اس رمضان سے اگلے رمضان تک پیش آنے والا ہے، ان فرشتوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے، جو کائنات کی تدبیر اور امور نافذ کرنے پر مامور ہیں اس میں ہر انسان کی عمر، موت، رزق، بارش وغیرہ کی مقداریں سب کچھ ہیں، یہاں تک کہ یہ بھی لکھ دیا جاتا ہے کہ فلاں شخص کو اس سال حج نصیب ہوگا۔

شب قدر امت محمدیہ کے لیے ایک بڑی نعمت: نبی کریم ﷺ کی امت کیلئے اللہ کی طرف سے یہ رات ایک عطیہ اور انعام ہے، اور اس میں جو عبادت کی جائے وہ سالہا سال کی عبادت کے اجر سے زیادہ کی حیثیت رکھتی ہے، اس امت کو یہ عظیم ترین مبارک رات کس لیے عطا کی گئی، اس بارے میں مفسرین نے مختلف واقعات ذکر کئے ہیں، معارف القرآن میں حضرت مفتی محمد شفیعؒ نے لکھا ہے کہ ابن ابی حاتم نے مجاہد سے مرسلاً روایت کیا ہے وہ اس طرح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی اسرائیل کے ایک مجاہد کا حال ذکر کیا جو ایک ہزار مہینے تک مسلسل مشغولِ جہاد رہا، کبھی ہتھیار نہیں اتارے، مسلمانوں کو یہ سن کر تعجب ہوا، اس پر یہ سورۂ قدر نازل ہوئی جس میں امت محمدیہ کے لیے صرف ایک رات کی عبادت کو اس مجاہد کی عمر بھر کی عبادت یعنی ایک ہزار مہینے سے بہتر قرار دیا ہے۔

مفسر قرآن ابن جریر نے بروایت مجاہد ایک دوسرا واقعہ یہ ذکر کیا ہے:

> ''بنی اسرائیل میں ایک عابد کا یہ حال تھا کہ ساری رات عبادت میں مشغول رہتا اور صبح ہوتے ہی جہاد کے لیے نکل کھڑا ہوتا، دن بھر جہاد میں مشغول رہتا، ایک ہزار مہینے اس نے اسی مسلسل عبادت میں گذار دیئے، اس پر اللہ تعالیٰ نے سورۂ قدر نازل فرما کر اس امت کی فضیلت سب پر ثابت فرمادی، یعنی اس ایک رات میں عبادت کر لینا اس بنی اسرائیل کی ہزار مہینے کی عبادت سے بہتر ہے۔'' (جامع البیان فی تفسیر القرآن)

ان روایتوں سے الگ اور بھی روایتیں اسی طرح کے مفہوم کی ملتی ہیں، مگر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی روایت بہت زیادہ موزوں اور قرین عقل لگتی ہے جس میں انھوں نے ذکر کیا ہے:

''انھوں نے ایک ثقہ و معتبر عالم سے یہ بات سنی کہ رسول اللہ ﷺ کو اگلے لوگوں کی عمریں

بتلائی گئیں، جتنا اللہ کو منظور تھا تو آپ ﷺ نے اپنی امت کے لوگوں کی عمروں کو کم سمجھا، اور یہ خیال کیا کہ میری امت کے لوگ (اتنی کم عمر میں) ان کے برابر عمل نہیں کر سکتے، تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو لیلۃ القدر عطا فرمائی، جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ (مؤطا امام مالک)

ابن کثیر نے تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ شب قدر امت محمدیہ کی خصوصیات میں سے ہے، بعض ائمہ شافعیہ نے اس کو جمہور کا قول لکھا ہے۔

لیلۃ القدر کی چار خصوصیات: سورۃ القدر میں شب قدر کی چار خصوصیات کا ذکر ہے:

۱-اس رات میں قرآن مجید کا نازل ہونا۔

۲-یہ رات ہزار مہینوں سے افضل و بہتر ہے۔

۳-اس رات میں پروردگار کے حکم سے ہر امر خیر کو لے کر فرشتے نازل ہوتے ہیں۔

۴-اس رات میں صبح صادق تک خیر و برکت اور امن و سلامتی ہے۔

۱-ماہ رمضان المبارک میں آسمانی دنیا پر قرآن کریم کے نازل ہونے کے بارے میں تو دوسری آیت موجود ہے، شهر رمضان الذی انزل فيه القرآن، رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا، مگر اس سورت میں واضح طور پر بتایا گیا کہ قرآن کا نزول شب قدر میں ہوا۔ جس کا ایک مطلب یہ ہے کہ پورا قرآن لوحِ محفوظ سے اس مبارک رات میں اتارا گیا، پھر جبرئیل علیہ السلام اسی کو وقفہ وقفہ سے تیئیس سال کے عرصے میں حسب ہدایت ربانی تھوڑا تھوڑا لاتے رہے، اور یہ بھی مفہوم ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید نازل ہونے کی ابتدا شب قدر کی رات میں چند آیتوں سے ہوگئی، باقی حصہ بعد میں نازل ہوتا رہا، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ ہر سال میں جتنا قرآن نازل ہونا مقدر ہوتا تھا اتنا ہی شب قدر میں لوحِ محفوظ سے سماء دنیا پر نازل کر دیا جاتا تھا۔ (قرطبی، معارف القرآن)

۲-لیلۃ القدر کو ہزار مہینوں سے افضل قرار دیا گیا، یعنی اس رات جو عبادت ہوگی وہ ایک ہزار مہینے یعنی تراسی سال سے زائد کی عبادت سے بھی اجر و ثواب میں بہتر ہوگی، ایک ہزار مہینوں میں تقریباً ۳۰/ہزار راتیں ہوتی ہیں، گویا اللہ تعالیٰ کی رضا اور قربِ الٰہی کا حصول جو ایک رات میں میسر ہو سکتا

ہے وہ سچے طلبگاروں کو بھی ایک ہزار رات میں حاصل ہو سکتا ہے۔

حدیث میں یہ بھی آتا ہے کہ اس مہینے میں نفل عبادت بھی اجر و ثواب کے لحاظ سے فرض عبادت کے برابر ہوتی ہے اور لیلۃ القدر کی خصوصیت تو رمضان کے باقی ایام سے بھی زیادہ اہمیت اور فضیلت کی حامل ہے، ایسے میں نیکیوں کا ذخیرہ اتنا ہو جاتا ہے کہ اس کا شمار ہی مشکل ہوگا۔

۳- اس رات میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے فرشتے نازل ہوتے ہیں، اور روح یعنی جبرئیل علیہ السلام بھی جیسا کہ ایک روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب شب قدر ہوتی ہے تو جبرئیل علیہ السلام فرشتوں کی بڑی جماعت کے ساتھ زمین پر اترتے ہیں او رجتنے اللہ کے بندے مرد و عورت کھڑے ہوئے یا بیٹھے ہوئے اللہ کے ذکر و عبادت میں مشغول ہوتے ہیں سب کے لیے رحمت کی دعا کرتے ہیں۔ (شعب الایمان، بیہقی، مشکوٰۃ)

بعض روایتوں میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ وہ انھیں سلام کرتے ہیں یعنی ان کو سلامتی کی دعا دیتے ہیں۔

بہر حال اس حدیث کی روشنی میں بات صاف ہو جاتی ہے کہ خصوصی طور پر اللہ تبارک و تعالیٰ حضرت جبرئیل علیہ السلام کی سرکردگی میں فرشتوں کی ایک جماعت بھیجتے ہیں تاکہ وہ جائزہ لیں کہ کون مرد و عورت عبادت اور ذکر میں مشغول ہیں، نماز کی حالت میں یا تلاوت و تسبیح اور دعا کی کیفیت میں، اور جب انھیں عبادت میں مصروف دیکھتے ہیں تو امن و سلامتی اور رحمت کی دعائیں دیتے ہیں، اور یہ سب باری تعالیٰ کے حکم اور ہدایت کے بموجب ہوتا ہے۔

۴- لیلۃ القدر کی ایک اہم خصوصیت ذکر کی گئی "**سلام ھی حتی مطلع الفجر**" یعنی لیلۃ القدر سلامتی اور برکت والی ہے، اور یہ برکات رات کے کسی خاص حصے میں نازل نہیں ہوتیں بلکہ رات کی ابتدا سے لے کر صبح صادق تک محیط ہے۔

بعض مفسرین حضرات نے یہ مطلب بتایا ہے کہ یہ رات ہر شر و آفت اور بری چیز سے سلامتی ہے، قرطبی لکھتے ہیں کہ یہ رات سلام اور سلامتی ہے، خیر ہی خیر ہے، اس میں برائی کا نام ہی نہیں، فرشتے

اس میں خیر و برکات اور سعادتیں لے کر نازل ہوتے ہیں۔

اور جیسا کہ حدیث میں وارد ہے کہ یہ فرشتے عبادت گذاروں کو سلام کرتے ہیں، سلامتی کی دعا دیتے ہیں۔

تفسیر مظہری میں لکھا ہے کہ یہ فرشتے ہر وہ امر لے کر آتے ہیں جو خیر و سلامتی ہو۔

شب قدر کون سی رات ہے؟: یہ تو قرآن سے ہی متحقق ہو چکا کہ شب قدر ماہ رمضان المبارک میں آتی ہے مگر تاریخ کے تعین میں علماء کے مختلف اقوال ہیں، البتہ اس رات کی متوقع آمد کے بارے میں صحیح احادیث ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔

صحیح بخاری میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''**تحروا ليلة القدر في العشر الأواخر من رمضان**''یعنی شب قدر کو رمضان کے آخری عشرے میں تلاش کرو، گویا رمضان کے آخری عشرے میں کوئی بھی رات شب قدر ہو سکتی ہے، مگر زیادہ تر علماء و مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ آخری عشرے کی طاق راتوں میں شب قدر ہوتی ہے یعنی ۲۱- ۲۳-۲۵-۲۷-۲۹، اور اس کی تائید ایک صحیح حدیث سے ہوتی ہے۔ مسلم شریف کی ایک روایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شب قدر کو رمضان کے عشرۂ اخیرہ میں کی طاق راتوں میں طلب کرو۔ تفسیر مظہری میں لکھا ہے: صحیح یہ ہے کہ لیلۃ القدر رمضان کے آخری عشرے میں ہوتی ہے، مگر کوئی خاص تاریخ متعین نہیں ہے، بلکہ ان میں سے کسی بھی رات ہو سکتی ہے اور وہ ہر رمضان میں بدلتی بھی رہتی ہے اور ان دس راتوں میں سے از روئے احادیث صحیحہ طاق راتوں میں زیادہ احتمال ہوتا ہے۔

یہاں یہ بھی واضح رہے کہ اختلافِ مطالع کے سبب مختلف ملکوں اور شہروں میں شب قدر مختلف دنوں میں ہو تو اس میں کوئی اشکال نہیں، کیوں کہ ہر جگہ کے اعتبار سے جو رات شب قدر قرار پائے گی اس جگہ اسی رات میں شب قدر کے برکات حاصل ہوں گے۔ (معارف القرآن ج ۸)

بہت سی جگہوں پر اور کم پڑھے لکھے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ۲۷ ر رمضان کی رات ہی شب

قدر ہوتی ہے وہ قطعی بے سروپا ہے، اس لیے اخیر عشرے کی ہر رات کو عبادت میں اس طرح گذارنا چاہیے کہ وہی شب قدر ہے، خاص طور پر ہر طاق رات کو عبادت کا التزام ہونا چاہیے تاکہ لیلۃ القدر کا اجر اور اس کے برکات وفیوض سے محرومی نہ ہو۔

شب قدر کی عبادت: عبادت کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں جو شب قدر میں مطلوب ہیں، نفل نماز میں کھڑے ہونا، قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول ہونا، تسبیح وذکر میں لگنا، اور دعائیں کرنا، بخاری ومسلم کی روایت کے مطابق نفل نماز زیادہ موزوں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شب قدر میں عبادت کے لیے کھڑا رہے اس کے تمام پچھلے گناہ معاف ہو گئے۔

تلاوتِ قرآن بھی ایسی ایک عبادت ہے جس کا اجر بذات خود بہت ہے اور شب قدر میں تو اس کا اجروثواب بے انتہا بڑھ جاتا ہے، اس کے ساتھ مغفرت کی دعا کا بھی اہتمام ہونا چاہیے، قرطبی میں لکھا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اگر میں شب قدر کو پاؤں تو کیا دعا کروں، آپ نے فرمایا یہ دعا کرو: ''**أللّٰهم انک عفو تحب العفو فاعف عني**'' یعنی اے اللہ! تو بہت معاف کرنے والا ہے، اور معافی کو پسند کرتا ہے، میری خطائیں معاف فرما!

شب قدر میں جتنی عبادت ہو بہتر ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ رات بھر جاگ کر مشغولِ عبادت ہو جب ہی اس کا اجر حاصل ہوتا ہے، جتنی عبادت کرلے اتنا ہی ثواب پائے گا، حتی کہ روایت میں آتا ہے کہ اگر اس رات عشا اور فجر کی نماز بھی جماعت سے ادا کرلے تو مکمل عبادت کا ثواب حاصل ہوجائے گا۔ صحیح مسلم میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرلی تو اس نے آدھی رات کے قیام کا ثواب پالیا اور جس نے صبح کی نماز بھی جماعت سے ادا کرلی تو پوری رات جاگ کر عبادت کرنے کا ثواب حاصل کرلیا۔

☆......☆......☆

اردو ادب

اکبر الہ آبادی۔۔ایک نیا بیانیہ

ڈاکٹر تحسین فراقی

آج سے چالیس پینتالیس برس پہلے ہمارے ہاں مزاحمتی ادب کا ذکر بڑے تواتر سے رہتا تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کی ایک عجیب ہنگامہ خیز ہانک پکار تھی۔ نعروں اور محض سطحی طبقاتی غیظ و غضب کے اظہار کو سچے اور اصلی ادب کا قائم مقام سمجھا جانے لگا تھا اور یہ بات بھلا دی گئی تھی کہ سچا ادب نئی علامتوں اور تازہ استعاروں کو نئے احوال کے پیشِ نظر وضع کرتا اور بقول عسکری، نئے جذباتی مرکبات پیدا کرتا ہے اور لوگوں کی جذباتی اور فکری دنیا میں ایسی علامتوں کی چولیں اس خوبی سے بٹھاتا ہے کہ وہ ہمارے لیے برگزیدہ اور برتر زندگی گزارنے کے جمالیاتی اشارے بن جاتی ہیں۔ اکبر الہ آبادی نے اپنی شاعری سے یہی کام لیا اور مغربی استعمار کے بے پناہ سیلاب کے آگے اپنے توانا اور نادر اسلوبِ شعر کے وسیلے سے بند باندھنے کی کوشش کی۔ اس اسلوبِ شعر کو مسلم تہذیب وثقافت کی روشن روایات نے خونِ تازہ مہیا کیا تھا۔ انہوں نے اس نام نہاد نعرۂ ترقی کی قلعی بڑی خوبی سے کھولی جو ماضی کی روشن روایتوں سے کٹ کر محض مادی اور حیوانی طرزِ زندگی ہی کو معراج سمجھنے لگتا ہے۔ یوں گویا اکبر نے مغربی طرزِ زیست کے بالمقابل ایک نیا بیانیہ وضع کیا اور برعظیم کے مسلمانوں کے دلوں میں اس کی ابدی صداقت اور حقانیت کا نقش بٹھانا چاہا، ایک ایسا نقش جو سرسید کی فکر کے مقابلے میں کہیں زیادہ پائیدار اور دوام کا حامل تھا۔ یہی نقش بعد ازاں اقبال کے ہاں صورِ اسرافیل کے حیات خیز شعری پیرائے میں ڈھلتا دکھائی دیتا ہے۔ میں بڑی دیانت داری سے محسوس کرتا ہوں کہ اگر اکبر نہ ہوتے تو اقبال وہ نہ ہوتے جو وہ تھے۔ اقبال کے شعری کمالات اکبر سے بہ مراتب آگے تھے مگر

ان کی فکری بنیادوں میں اکبر کا فیضان بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔آج صرف پاکستان ہی کا نہیں پورے برعظیم کا تعلیمی نظام تلپٹ،فرسودہ اوراعلیٰ اخلاقی وروحانی اقدار کا قاتل اورتباہ کارنظر آتا ہے مگر اس کے متوقع خطرات کی جس بالغ نظری سے اکبراور بعدازاں اقبال نے پیش قیاسی کی تھی،وہ آسانی سے نظرانداز نہیں کی جا سکتی۔ یہ بات بھی کچھ کم حیران کن نہیں کہ اکبر کے شعری حاصلات صرف برعظیم تک محدود نہیں رہے۔اقبال سے پہلے اکبر کا مشرق اورایشیا کی طرف متوجہ ہونا ان کی وسعتِ نظر کی ایک قوی برہان مہیا کرتا ہے۔دیکھیے کس دردمندی سے کہتے ہیں:

ولوے لے کے نکلنے لگے کالج کے جواں
شرمِ مشرق کے عدو، شیوہئ مغرب کے شہید
مسجدیں چھوڑ کے جا بیٹھے ہیں میخانوں میں
واہ کیا جوشِ ترقی ہے مسلمانوں میں
ہوتا ہے نفخ، یورپین نان پاؤ سے
میں خوش ہوں ایشیا کے خیالی پلاؤ سے
رہی رات ایشیا غفلت میں سوتی
نظر یورپ کی کام اپنا کیا کی
اب تو جاگو ایشیائی بھائیو
نیند میں غفلت کی، صدیوں سو لیے
حکومت ایشیا پرقسمتِ مغرب میں ہے جب تک
کمالات اس کے جو ہیں ہم کو حاصل ہو نہیں سکتے
کہو یہ رندانِ ایشیا سے کہ بزمِ عشرت کے ٹھاٹھ بدلیں
اڑن کھٹولا ہے اب مسوں کا، گئی پری جان کی وہ ڈولی

اس آخری شعر ہی کو دیکھ لیجیے۔بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اکبر تبدیلی کے مخالف نہیں،مؤید تھے مگر محض تبدیلی کے نہیں،مثبت،عمودی اور حیات خیز تبدیلی کے۔ اکبر کا بیانیہ موافقت سے نہیں،

مبارزت اور صلابت سے زندگی پاتا ہے۔ ذرا دیکھیے علامتی پیرائے میں کیا کیا کچھ کہہ گئے ہیں:

تو خاک میں مل اور آگ میں جل، جب خشت بنے تب کام چلے
ان خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ، تعمیر نہ کر
اشارہ چشمِ شوقِ مشرقی سے ہے یہ مغرب کا
جو قوت ہو تو بسم اللہ منہ تکنے کا کیا حاصل؟

حقیقت یہ ہے کہ دھیمے دھیمے انداز میں مبارزطلبی کی اکبر کی یہی تلقین اقبال کے ہاں ایک رجز کی شکل اختیار کرتی نظر آتی ہے۔ رشوت، ترغیب، افتراق، تلقین اور عیاری کے حربوں سے سات سمندر پار سے آنے والے سامراج نے کس طرح شیخ کو یخ اور مومن کو موم کر دیا، اس کا لطیف رمزیہ انداز اکبر کے ہاں دیدنی اور خواندنی ہے:

سر تراشا ان کا، کاٹا ان کا پاؤں
وہ ہوئے ٹھنڈے، گئے یہ بھی پگھل
شیخ کو یخ کر دیا، مومن کو موم
دونو کی حالت گئی آخر بدل

سوا سو ڈیڑھ سو برس پہلے اکبر نے ایسی ایسی باتیں اشاروں کنایوں میں اپنی شاعری میں کہہ ڈالیں، جنھیں ان کے اکثر معاصرین نے لائقِ توجہ ہی نہ جانا یا انھیں محض ہنسی مذاق سمجھا مگر جو آج حرف بہ حرف سچ ثابت ہو رہی ہیں اور اکبر کی توانا اور دوررَس نگاہ کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ آج عالمگیر مشینی انقلاب نے ہمارے ماحولیاتی نظام (ایکو سسٹم) کو جس طرح برباد کر کے رکھ دیا ہے، اردو میں اس کی جانب اولیں اشارے ہمیں اکبر (یا نثر میں ایک آدھ جگہ ڈپٹی نذیر احمد کے ہاں) کی شاعری میں ملتے ہیں اور ہمیں حیرت سے دوچار کرتے ہیں۔ مشین نے صرف فضا ہی کو نہیں بلکہ پانی کو بھی آلودہ کر دیا ہے، صوتی اور آبی آلودگی اس سیارے کی مخلوقات کے لیے وبالِ جان بن گئی ہے۔ آبی حیات تیزی سے نابود یا ناکارہ ہو رہی ہے۔ کل ہی ہمارے ایک معاصر نے خبر دی ہے کہ دریائے سندھ میں کثرت سے پائی جانے والی ڈالفن تیزی سے نابود ہو رہی ہے۔ کاش ہم اس نام نہاد بے لگام

صنعتی اور سائنسی ”ترقی“ کو کسی حد میں رکھتے۔ المیہ یہ ہے کہ نہایت خوبصورت پرندوں کی کئی نسلیں نایاب سے معدوم کی سرحد تک جا پہنچی ہیں۔ اس جمالیاتی آشوب کی طرف اکبر کے معنی خیز اشارے ملاحظہ کیجیے:

ابھی انجن گیا ہے اس طرف سے
کہے دیتی ہے تاریکی ہوا کی
نہیں سائنس واقف کارِ دیں سے
خدا باہر ہے حدِ دوربیں سے
مشینوں نے کیا نیکوں کو رخصت
کبوتر اڑ گئے انجن کی پیں سے

اور اب اسی ضمن میں اکبر کا ایک فارسی شعر حافظ کی زمین میں بھی سن لیجیے۔ فرماتے ہیں:

عبث اے بے ہنر قربِ مشینِ مغربی خواہی
کہ جز دُودے ترا حاصل نمی گردد ازیں ملہا

(اے بے ہنر! تو مغربی مشینوں کا قرب خواہ مخواہ حاصل کرنے کا خواہاں ہے حالانکہ ان ملوں سے تجھے سوائے دھویں کے کچھ حاصل نہ ہوگا)۔ خیر اب تو نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ صرف ایک عالمی طاقت (ویسے برطانیہ کی نظر میں وہ اب سپر پاور نہیں رہی) کی کارگاہوں نے پچھلے اسی پچاسی برس میں دھڑا دھڑ اس کثرت سے ایٹمی اسلحہ اگل دیا ہے جس سے اس مظلوم سیارے کو پچاس ساٹھ بار تباہ کیا جا سکتا ہے۔ اکبر نے تو ایک لحاظ سے آبی آلودگی کی طرف بھی بلیغ اشارے کر دیے تھے جب وہ پائپ سے ملنے والے پانی سے بیزاری ظاہر کرتے ہیں جس کے نتیجے میں پیٹ چلتا ہے اور گویا پورے وجود میں ادھم مچاتا ہے! اکبر کے بعد اقبال ہی وہ دوسرے بے مثل اور دردمند دانشور ہیں جنھوں نے زیادہ موثر انداز میں انسانی معاشرت پر مشین کی حکومت کے خلاف احتجاج کیا اور یہاں تک کہہ دیا:

تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے
یہ وادیِ ایمن نہیں شایانِ تجلی

اور پھر یہ بھی کہا:

اک شور ہے مغرب میں اجالا نہیں ممکن
افرنگ مشینوں کے دھویں سے ہے سیہ پوش

یہاں ایک اور افسوسناک صورت حال کی طرف بھی توجہ دلانا بے محل نہ ہوگا۔ ہماری موجودہ دانشگاہیں جس تیزی سے بے جہت اور ہدف نا آشنا مراکز میں تبدیل ہوگئی ہیں، اس پر کچھ کہنا تحصیل حاصل کے مترادف ہے۔ کیا اکبر کا درج ذیل شعر ہماری انھی دانشگاہوں کی سمت نا آشنا صورت حال کا عکاس نہیں کہ نوجوان ہاتھوں میں ڈگریاں لیے سڑکیں ناپتے پھرتے ہیں اور نوکریاں ایک ایک سے بہ زبانِ حال کہتی ہیں: گُم شو، دور باش!

ہیں عمل اچھے مگر دروازۂ جنت ہے بند
کر چکے ہیں پاس لیکن نوکری ملتی نہیں

اور معاملہ صرف یہیں تک نہیں۔ کیا وطنِ عزیز میں بجلی کی قیمتوں میں روز بروز سفاکانہ اضافے اور بلبلا دینے والے ہوش ربا بل، آپ کو اکبر کا یہ شعر یاد نہیں دلاتے؟

لکھے گا کِلکِ حسرت دنیا کی ہسٹری میں
اندھیر ہو رہا تھا بجلی کی روشنی میں

اور یہ اندھیر صرف بجلی کی روشنی ہی نے نہیں مچایا۔ اسکے پیچھے اصل اندھیر ان سفاک بین الاقوامی اداروں نے مچا رکھا ہے جنھیں آئی ایم ایف، ورلڈ بینک اور ڈبلیو ٹی او کے خوشنما ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ چونکہ غلام قومیں اپنی بے لگام خواہشوں کی اسیر ہیں لہٰذا وہ قرضوں پر قرضے لیے جاتی ہیں اور افرادِ قوم کو غلام در غلام کی نا مختتم زنجیروں میں جکڑے جا رہی ہیں۔ اکبر نے ہمیں سو سوا سو سال پہلے خبردار کرتے ہوئے کس دکھ سے کہا تھا:

اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں جال کا
طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا

☆......☆......☆

یادگارِ زمانہ

حضرت مفتی محمود اشرف رحمہ اللہ کی کچھ یادیں

مفتی محمد اویس ارشاد

استاذ جامعہ دار العلوم کبیر والا

دنیا ہر دور میں ایسے حضرات سے مزین رہی ہے، جو مقصدِ تخلیق کائنات پر عمل پیرا ہوکر نظام کائنات کی بقا کا سبب ہوتے ہیں، یہ اللہ والے حضرات ذاتی اغراض و مفادات سے بالاتر ہوکر اللہ کی زمین پر اللہ کی شریعت کی اشاعت و دفاع میں مگن رہتے ہیں، **لا یخافون لومة لائم** کا مصداق ہوتے ہیں۔ یہ مدح و منفی تنقید سے ماوراہوکر دین کی صحیح تعبیر کررہے ہوتے ہیں اور دین کی من مانی تشریح کو دلائل کی قوت سے رد کردیتے ہیں۔ ایسے محققین، مفسرین و محدثین اور اہل علم وفن، اہل تقویٰ ہی درحقیقت حضرات انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں۔

استاذِ محترم حضرت مولانا مفتی محمود اشرف عثمانیؒ ایسے ہی محقق، متقی عالم باعمل تھے۔ جامعہ دار العلوم کراچی کے بڑے اکابر میں شمار تھا۔ اپنے معتدل ذوق و مزاج، مشفقانہ رویہ، علمی تعمق، تحقیقی طرز، منفرد طریقۂ تدریس اور تقویٰ وللٰہیت کی بنا پر طلباء میں انتہائی مقبول تھے، بالخصوص دورۂ حدیث اور تخصص کے ہر طالب علم کی زبان پر استاذ جی کا نام ہوتا تھا۔

علومِ تفسیر، حدیث، فقہ وافتاء سے بہت رغبت تھی۔ فرماتے: دورۂ حدیث صِرف حدیث ہی کا نہیں تفسیر کا بھی دورہ ہے۔ آپ بخاری اسی انداز میں پڑھاتے۔ احادیثِ مبارکہ کو آیات پر منطبق کرتے جاتے۔ بظاہر متعارض نصوص میں حتی الامکان تطبیق دینے کی کوشش فرماتے۔ ایک بار فرمایا:

> "حضرت گنگوہی رحمہ اللہ ایسی نصوص کا ایسا محمل بیان کرتے کہ تمام صحیح وضعیف احادیث باہم منطبق ہوجاتیں، میرا ذوق بھی حضرت گنگوہیؒ والا ہے۔"

آپ کی تدریس ایسے سلیس، دل موہتے انداز سے ہوتی کہ طالب علم آپ کے درس میں متیقظ رہتا، جس کی وجہ سے درس کی مشکل مباحث بھی طالب علم کو باسانی سمجھ آتی جاتیں۔ آپ کا ذوق تھا کہ استاذ خود محنت زیادہ کرے، اور دورانِ سبق ہی طالب علم کو سبق سمجھا کر ذہن نشین کرا دیا کرے۔

فقہ وافتاء تو آپ کی پوری زندگی کا اوڑھنا بچھونا رہا۔ آپ کی زندگی کا اکثر حصہ فتویٰ کی خدمت میں صرف ہوا۔ خودنوشتہ ودستخط شدہ فتاویٰ کی تعداد لاکھوں میں پہنچتی ہے۔ فتویٰ نویسی کو انتہائی اہم اور نازک ذمہ داری سمجھتے تھے۔ فتویٰ میں کمزور بات، کمزور انداز، بے احتیاطی بالکل برداشت نہیں کرتے تھے۔ بدمحنتی، بے توجہی سے فتویٰ لکھنے پر تو متخصص کو سخت تنبیہ فرماتے۔

فتویٰ دیکھنے میں سرعت، تیقظ وتوجہ، بھرپور اصلاح، شاندار تعبیر غرض ہر پہلو سے شاندار مہارت حاصل تھی۔ فرمایا کرتے تھے: "فتویٰ کی تعبیر دیکھتے ہی معلوم ہوجاتا ہے کہ طالب علم نے اِس فتویٰ کی تیاری میں کس قدر محنت کی ہے۔"

جس طالب علم کو فتویٰ سے مناسبت نہ ہوتی، اسے مشورہ دیتے: "آپ کسی اور دینی یا دنیاوی خدمت میں مشغولیت اختیار کرلیں۔ کہیں اپنے فتاویٰ کے ذریعہ امت کی گمراہی کا سبب نہ بن جائیں۔"

بغیر دلیل کے فتویٰ حضرت کے ہاں قابلِ قبول نہیں تھا۔ ایک بار کسی ساتھی نے بغیر حوالہ کے جواب لکھ دیا، حضرت نے فرمایا: "اِس کی دلیل؟" طالب علم نے شرمندہ سا ہوکر پریشان چہرہ بنالیا۔ فرمایا: "مولانا! آپ کی بات ہم صِرف اِس لیے تو نہیں مان سکتے کہ آپ نے کرتا پہنا ہوا ہے، سر پہ ٹوپی ہے اور شلوار ٹخنوں سے اوپر رکھی ہوئی ہے۔ فتویٰ کے لیے تو دلیل دینی پڑے گی"۔

فتویٰ میں قرآن وحدیث کے دلائل ذکر کرنے کی ترغیب دیتے تھے، البتہ فقہاء کرام کی کتب کا حوالہ بھی ضروری ہوتا۔ ایک بار فتویٰ میں دلیل کے طور پر صِرف قرآن مجید کی آیت ذکر کردی، فرمایا: "تم براہِ راست قرآن مجید سے استدلال کرنے والے کون ہوتے ہو، ہمیں تو اِس آیت سے فقہاء کرام کا استدلال دکھاؤ۔"

ایک ساتھی نے فتویٰ میں تمام تر حوالہ جات کتبِ تصوف سے دیے، حضرت نے جب ملاحظہ کیا تو فرمایا: "مولوی صاحب! تصوف کی کتابیں پڑھ کر، چوم کر رکھنے کے لیے ہوتی ہیں، فتاویٰ تو فقہاء کی

کتابوں سے لکھے جاتے ہیں۔"

دروس، وعظ ونصیحت، فتویٰ کے ذریعہ طلباء میں حقیقت پسندی، اعتدال کا ذوق منتقل کرنے کی بھرپور کوشش فرماتے۔ دینداری کے محدود تصور کے قائل نہیں تھے۔ عبادات کے ساتھ معاملات و اخلاقیات کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ فراغت کے بعد ایک بار میں استاذ جی کی خدمت میں حاضر ہوا، نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

"مولوی صاحب! آپ خطیب لوگ منبر پر عبادات تو کثرت سے بیان کرتے ہو، معاشرتی مظالم کے خلاف کوئی بات نہیں کرتے، شوہر کے بیوی پر ظلم، تاجروں کے عوام پر ظلم کے خلاف بیان کرنے کا رواج نہیں ہے۔"

حضرت تھانوی رحمہ اللہ سے بہت مناسبت تھی، اپنے واٹس ایپ اسٹیٹس پہ روزانہ حضرت کے ملفوظات آویزاں فرماتے۔ اکثر ملفوظات معاشرتی اصلاح وتربیت، اخلاق ومعاملات کی درستگی سے متعلق ہوتے تھے۔

معاملات ومعاشرت درست نہ ہونے کی صورت میں محض ظاہری وضع قطع اختیار کرنے کو دینداری نہیں سمجھتے تھے۔ ایک بار فرمایا:

"بزرگ تو ایک ہزار روپے میں تیار ہوجاتا ہے، آج کل ذرا مہنگائی ہے تو دو ہزار خرچ ہوجائیں گے، کرتا، ٹوپی وغیرہ دو ہزار میں لے کر بغیر کسی محنت اور معاشرت کی درستگی کے بزرگ بن گئے، درحقیقت یہ کوئی بزرگی نہیں۔ اللہ والا بننے کے لیے بہت محنت کرنا ہوتی ہے، اللہ والوں کی مجالس میں عرصہ تک دوزانو ہونا پڑتا ہے، عرصہ دراز تک ان سے استفادہ کرنے کے بعد جا کر کوئی تھوڑا بہت سیکھ پاتا ہے۔"

محض ظاہری وضع قطع اختیار کرنے اور صِرف مدرسہ میں پڑھنے، پڑھانے ہی کو بزرگی کا معیار نہیں سمجھتے تھے۔ (جبکہ دیگر نجی، معاشرتی، معاملات وغیرہ خلافِ شریعت ہوں) طلباء وعلماء کو بھی باور کراتے کہ محض دینی علوم میں مشغولیت دیکھ کر خود کو بزرگ نہ سمجھنے لگنا، اکثر فرماتے:

"ہر مولوی صاحب کو یہ حدیث ملحوظ رکھنی چاہیے: إن اللہ لیؤید ھذا الدین بالرجل الفاجر، ڈرتے رہا کرو کہ دین کی خدمت کے باوجود کہیں ہم اِس حدیث کا مصداق نہ ہوں۔"

ہمارے ایک ساتھی نے اپنے پانچ سالہ بیٹے کی حفظِ قرآن سے پہلے اسکول میں ابتدائی تعلیم کے بارے میں استاد جی سے مشورہ کیا اور اِس خوف کا اظہار کیا کہ اسکول میں اچھے برے ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں، اسکول بھیجنے پر کہیں بچہ بگڑ نہ جائے، سن کر فرمایا:

"مولانا! آپ کی بات مجھے اچھی نہیں لگی، تو مدرسہ میں کیا سب ہی اچھے ہوتے ہیں؟ ہر جگہ اچھے برے لوگ ہوتے ہیں اور جو اچھے ہوتے ہیں وہ سو فیصد اچھے نہیں ہوتے، ان میں کمی کوتاہی ہوتی ہے، اور کوئی شخص کامل برا نہیں ہوتا، اُس میں کچھ اچھائیاں بھی ہوتی ہیں، حتی کہ کافر میں بھی کچھ اچھی باتیں موجود ہوتی ہیں۔ اِس لیے آپ بچہ پر اپنی کامل توجہ دیں، درست تربیت کا اہتمام کریں، باقی معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیں۔"

استاذ محترم رحمہ اللہ کو اکابر اور حقیقی بزرگانِ دین سے بہت محبت تھی۔ خود کامل ہونے کے باوجود تقریباً پوری زندگی اسلاف سے اصلاح وتربیت کا تعلق رکھا۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی صاحب، حضرت حاجی شریف صاحب ملتانی، حضرت ڈاکٹر عبدالحئی عارفی صاحب، حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب، حضرت ڈاکٹر حفیظ اللہ مہاجر مدنی، حضرت نواب عشرت خان قیصر صاحب اور حضرت مولانا عبیداللہ صاحب رحمہم اللہ سے باقاعدہ اصلاحی تعلق قائم رہا۔ بہت بڑے، محقق مفتی ہونے کے باوجود آپ کا اصلاحی تعلق ایسے بزرگوں سے بھی رہا جو رسمی عالم نہیں تھے، مگر اللہ کے ولی ہے۔ ایک بار استاد جی نے فرمایا:

"میں لاہور میں حدیث کے اسباق پڑھاتا تھا، جب ملتان حاضر ہوتا تو حدیث میں پڑھی ہوئی تمام باتوں کا عملی انطباق اپنے شیخ حاجی شریف صاحب رحمہ اللہ میں دیکھتا تھا۔"

بزرگوں سے یہ تعلق محض حصول نسبت کے لیے رسمی نہیں تھا، بلکہ سیکھنے کی غرض سے تھا۔ لاہور میں قیام کے دوران تقریباً ہر دو ہفتہ بعد ملتان میں اپنے شیخ حضرت حاجی شریف صاحب ملتانی کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ نیز صِرف حاضری لگوانے نہیں، بلکہ ان کی ہدایات پر مکمل عمل پیرا ہوتے تھے۔ ایک بار شیخ حاجی شریف صاحب نے استاذِ محترم سے فرمایا:

"میں نے آپ کو ایک بار سخت تنبیہ کی، آپ کو پوری زندگی کے لیے کافی ہوگئی۔"

بڑوں کے حکم وفیصلہ کو بہت اہمیت دیتے، مرض الوفاۃ کے دوران استاد جی ہسپتال نہ جانے پر مصر تھے۔گھر والوں نے حضرت شیخ الاسلام دامت برکاتہم سے درخواست کی کہ آپ حکم فرمائیں، حضرت تشریف لائے تو استاد جی نے لجاجت سے حضرت شیخ الاسلام سے کہا: ”حضرت آپ مجھے حکم نہ فرمائیں، حکم نہ ماننے سے مجھے بہت تکلیف ہوگی، مجھے معاف فرما دیں۔گھر رہنے میں سکون ہے، ہسپتال میں بے چینی ہوتی ہے۔“اِس پر حضرت شیخ صاحب نے استاد جی کی خواہش دیکھتے ہوئے گھر پہ ہی علاج کے ضروری آلات ومشینری کا انتظام کرادیا۔

انتہائی متواضع تھے، اپنی طرف سے نصیحت تک نہیں فرماتے تھے، درس ووعظ میں بھی قرآن و حدیث کی باتیں ذکر فرماتے، تشریح میں بزرگوں کے اقوال ارشاد فرماتے۔دارالعلوم کبیر والا کے استاذ، حضرت کے شاگرد، مولانا ابراہیم شاہ بتارہے تھے کہ **صحیح بخاری** کے آخری سبق کے بعد کتاب اٹھا کر جانے لگے تو طلباء نے نصیحت کی درخواست کی، واپس نشست پر تشریف لائے، فرمایا:

”اگر سارا سال حدیث سے کوئی نصیحت حاصل نہ ہوسکی محمود کی نصیحت کیا کام کرے گی۔“

حضرت مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے استاد جی کو ہفتہ میں ایک بار عصر کے بعد وعظ، درسِ قرآن شروع کرنے کا حکم فرمایا۔حکم کی تعمیل میں ابتداء گھر پہ یہ سلسلہ شروع ہوا۔اُس وقت فرمایا:

”مجھے بہت شرم آتی ہے، بڑے موجود ہیں، حضرت صدر صاحب، حضرت شیخ الاسلام صاحب، حضرت نواب صاحب جیسے حضرات کے ہوتے ہوئے میرے وعظ کی کیا ضرورت ہے، میں نے بہت عذر کیا مگر حضرات کا حکم ہے کہ ضرور کچھ عرض کیا کروں۔“

نماز یا کسی دیگر موقع پر استاد جی جب پیدل چلتے تو طلباء کے اپنے پیچھے چلتے رہنے کو سخت ناپسند کرتے تھے، فرماتے:

”پیچھے چلنے سے پیدا ہونے والی جوتوں کی آواز انسان کے دماغ میں تکبر پیدا کرتی ہے۔“

ایک ساتھی نے بتایا: ”ایک بار ایسا ہوا کہ میں روزانہ استاد جی کو نماز کے بعد سلام کرنے پہنچ جاتا، کچھ دن تو یہ سلسلہ چلتا رہا، پھر پوچھ لیا: ارے بھائی روزانہ کیوں مصافحہ کرنے آجاتے ہو؟ کہا: برکت کے لیے۔اِس پر ڈانٹ کر فرمایا: ”تو اِس کام کے لیے مجھے کیوں ملتے ہو، بزرگوں کو ملا کرو، ثواب تو ان

کی زیارت وملاقات سے ملتا ہے۔"

استاذ محترم کو تصنع ،تکلف کا انداز، گول مول باتیں بالکل پسند نہیں تھیں، صاف ستھری باتیں کرتے اور دوسروں سے بھی اسی کی توقع رکھتے ۔لوگوں کی راحت کا بہت خیال تھا، حضرت سے کوئی رابطہ کرتے تو فوری جواب دینے کی کوشش فرماتے ۔استاد جی سے متعلق بہت سے انجان لوگوں نے بتایا کہ ہم نے جب بھی حضرت سے واٹس ایپ کے ذریعہ استفتاء کیا تو جلد ہی جواب عنایت فرمایا۔ایسا لگتا ہے کہ ٹیکسٹ یا واٹس ایپ میسیجز آنے کے بعد جواب نہ دینا استاد جی کے لیے باعث کلفت ہوتا۔ایک ساتھی نے خط میں لکھا: کہ خط لکھتے ہوئے تامل ہوتا ہے کہ استاد جی کو کلفت ہوگی، استاد جی ہمارے ملازم تو نہیں ۔اِس پر حضرت نے جواب لکھا: "ہاں میں ملازم تو نہیں، البتہ خادم ہوں، بشرطیکہ کوئی مجھ سے محبت سے کام لے۔"

استاذ گرامی رحمہ اللہ بہت سے صفاتِ حسنہ سے متصف تھے، پوری زندگی علومِ دینیہ کی خدمت کو اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا، مدرسہ، اساتذہ، طلباء، گھر والے، خاندان سب ہی کے حقوق ادا کرتے رہے، مگر اِس کے باجود ستر سال کی عمر میں "تلافی مافات" کے عنوان سے ایک درخواست شائع کر کے حسرت کا اظہار فرمایا کہ احقر کو اللہ تعالیٰ نے بہت مہلت دی، نعمتوں کی بارش برستی رہی، مگر آخرت کی تیاری کی اب تک توفیق نہیں ہوئی، اب جب قبر کی منزل سامنے نظر آنے لگی تو فکر ہے کہ دنیا کی زندگی تو لشتم پشتم دن بھر کے کاموں کے نمٹانے میں ہی گذر گئی۔۔۔اب آخرت کا کیا ہوگا؟

حضرت استاذ صاحب رحمہ اللہ کا اپنے متعلق یہ گمان تھا، مگر آپ کے محبوب چچا شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم حضرتؒ کی قدر واہمیت کے خوب معترف ہیں ۔حضرت والد محترم مولانا ارشاد احمد صاحب دامت برکاتہم نے وفاق المدارس ملتان کے دفتر میں حضرت شیخ الاسلام کی خدمت میں حاضر ہوکر حضرتؒ کی وفات پر کلماتِ تعزیت کہے کہ آپ کے حضرت مفتی محمود اشرف صاحب کے بارے "محبوب بھتیجے" کے الفاظ پڑھ کر صدمہ میں اور اضافہ ہوگیا۔اِس پر حضرت شیخ الاسلام نے فرمایا:

"جی ہاں! بہت محبوب تھے، بہت لائق تھے، دار العلوم کا بہت نقصان ہوگیا ہے، اب اللہ تعالیٰ ہی یہ نقصان پورا فرمائے۔"

میرا مطالعہ

میری علمی ومطالعاتی زندگی

(دوسرا حصہ)

ڈاکٹر امجد علی شاکر

۱۹۷۸ء میں مَیں لیکچرر منتخب ہوگیا، اب میرے مطالعے میں خاصی وسعت آنے لگی، میں نے ۱۹۷۹ء میں ٹائن بی کی کتابیں پڑھیں، علی عباس جلال پوری کی عام فکری مغالطے، روحِ عصر، مقالاتِ جلال پوری، اقبال کا علمِ کلام، مقالاتِ وارث شاہ پڑھیں، بعد میں ان کی بقیہ کتابیں کائنات اور انسان، خرد نامۂ جلال پوری کا مطالعہ کیا، سبط حسن کی ماضی کے مزار، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، نویدِ فکر، انقلابِ ایران اور موسی سے مارکس تک میں نے محنت سے پڑھیں اور لطف لیا۔ میں نے ان کتابوں کو پڑھ کر علم بشریات سے شناسائی حاصل کی، یہ عجیب بات تھی کہ لوگ ان کتابوں سے مطالعے کو نفرت سے دیکھتے ہیں، میں نے ان کتابوں کے مطالعہ سے علم بشریات کی شد بد حاصل کی اور بس، میں نے ان کتابوں کو نہ عقیدت سے پڑھا، نہ عقیدے میں انہیں شامل کرنے کا سوچتا تھا۔

میں نے غلام احمد پرویز کی بعض کتابیں جماعتِ اسلامی کے ایک دوست کے ہاں دیکھیں اور مستعار لے کر پڑھیں، مجھے بعض کتابوں میں علامہ مشرقی کے اجمال کی تفصیل ملی اور بعض کتب میں سرسید کے نقطہ نظر کا پرتو ملا۔ واضح رہے کہ میں نے ۱۹۸۰ء میں سرسید احمد خاں کے مقالات کی چند جلدیں بہت غور سے پڑھ لی تھیں، ان کی خطباتِ احمدیہ بہت اہم کتاب ہے۔ مطالعہ سیرت میں اسے کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، پرویز کو پڑھتے پڑھتے مجھے احساس ہوا کہ انہوں نے یہ Thesis پیش کیا ہے کہ اسلام ایک نظام ہے اور اس پر عمل اُسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ اسے ریاست پر نافذ کیا جائے لیکن عجیب بات کہ ان کا نظامِ ربوبیت کسی طرح کی قانون سازی سے محروم

ہے، وہ آخر میں پند ونصائح کا باب کھول دیتے ہیں۔ میں نے یہ بات مولانا مودودی کہ ہاں دیکھی تھی کہ وہ اسلام کو ایک نظام خیال کرتے ہیں، ان کے نزدیک دین کے معنی ریاست کے ہیں، یہی پرویز کا نقطہ نظر ہے۔ مولانا بھی یہ سمجھتے ہیں کہ اس نظام کو ریاست پر نافذ کئے بغیر اس کے نتائج حاصل کرنے ممکن نہیں، دونوں حدیث کے بارے میں مختلف نقطہ نظر رکھنے کے باوجود دین کو نظام قرار دینے کے نقطے پر متفق ہیں۔ کچھ سال جب میں مارکس کو پڑھ رہا تھا، میں نے یہ اخذ کیا کہ مارکس نے اپنے فلسفے کے بارے میں ایسا ہی دعویٰ کیا ہے، ظاہر ہے وہ سیاسی فلسفی تھا، اس کے فلسفے کا انفرادی زندگی سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا، اس نے ریاستی نظام کی تبدیلی کا فلسفہ وفکر پیش کیا تھا، اس کا سیاسی فلسفہ ریاست پر نافذ کیے بغیر ایک ذہنی سرگرمی ہو کر رہ جاتا ہے۔ ان تینوں کو پڑھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ پرویز یا مولانا مودودی میں سے کسی ایک نے کامل مارکس کی آئیڈیالوجی کے پیٹرن پر اسلام کی تعبیر جدید کی ہے۔ پرویز جدید علوم زیادہ جانتے تھے اور وہ نئی بات پر شک کرنے میں بہت جری تھے۔ اس لیے تعبیر جدید کا سہرا پرویز کے سر سجتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے تعبیر کے طریقہ کار اور اندازِ فکر پرویز سے مستعار لیا ہے۔

میں نے کارل مارکس کو پڑھنا شروع کیا تو ابتدا میں پیپلز پبلشنگ ہاوس کے چند کتابچے اور پھر کتابیں پڑھیں، لینن اور اینگلر کی بعض کتب پڑھیں، سٹالن کی ایک ایک کتاب پڑھی، اس کے بعد کارل مارکس کو بھی لکھنا پڑھنا شروع کیا تو احساس ہوا کہ ابتدائی معاشیات کے مطالعے کے بغیر مارکس کو پڑھنا ممکن نہیں۔ ایف اے کی نصابی کتاب پہلے خود سمجھنے کی کوشش کی اور نا کام رہا، پھر اپنے ایک کولیگ سے سمجھنے کی کوشش کی، میں پھر بھی نا کام رہا، پھر ایک اور کولیگ سے سمجھنے کی کوشش کی نا کام رہا، وہ میرا مسئلہ سمجھ گئے۔ دراصل میں کتاب سمجھنا چاہتا تھا، مجھے کتاب کو یاد کر کے امتحان تو دینا نہیں تھا۔ انہوں نے مجھے K.K DEVITT کی تھیوریز آف ماڈرن اکنامکس پڑھنے کا کہا، میں نے یہ کتاب پڑھنا شروع کی تو حیران ہوا کہ ہر بات واضح ہو رہی تھی، اس کی تفہیم اس قدر آسان تھی کہ میں اش اش کر اٹھا۔ مجھے حیرت ہے کہ اردو میں لکھی ہوئی نصابی کتابیں میری سمجھ سے بالاتر تھیں اور انگریزی میں لکھی ہوئی کتاب میری انگلی تھام کر آگے بڑھ رہی تھی، اس کتاب کا پڑھنا تھا کہ مارکس میرے لیے

قابل فہم ہوگیا، اس کی تحریروں میں بہت سے علوم موجود ہیں۔ معاشیات کے حوالے سے اس کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے سرمایہ دارانہ علم معاشیات پر تنقید لکھی ہے۔ مارکس نے ”داس کیپیٹل“ میں جنس (Comodity) کی سادہ شکل سے پیچیدہ ترین شکل تک دیکھیں اور دکھائی ہے۔ اس نے سرمایہ دارانہ معاشیات کا پول کھول کے رکھ دیا ہے، اس طرح اس نے انقلاب کے حوالے سے اپنی تحریروں میں سرمایہ دارانہ جمہوریت کی حقیقت بھی کھول دی ہے، ظاہر ہے میں مسلمان ہوں، مجھے سیاسی نظاموں کو سمجھنا اور ان کی بنیاد میں موجود سرمایہ دارانہ یا گماشتہ سرمایہ دارانہ نظام کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ میں نے مارکس اور اس کے ہم خیال منکرین کو پڑھنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اسلام کے سیاسی نظام اور اقتصادی نظام پر لکھنے والے مولانا مودودی، مظہر الدین صدیقی اور بعض دوسرے عہدِ جدید کے سیاسی اور معاشی نظاموں سے یا تو کاملا بے خبر ہیں یا کم از کم اپنے قارئین کو بے خبر رکھنا چاہتے ہیں، ان بزرگوں نے زیادہ سے زیادہ سرمایہ داروں کی معاشیات کو پڑھا ہوگا۔ ان لوگوں نے مارکس کی تنقید کو نہیں پڑھا، یہ سرمایہ داروں کی معاشیات کو ہلکا سا میک اپ کر کے اسلامی معاشیات کا نام دیتے ہیں، مارکسزم کو تو انہوں نے پڑھا نہیں ہے، ان کی تحریروں سے بہر حال یہی واضح ہو رہا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ اپنے عہد کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ ۱۹۳۴ء میں مولانا مودودی حیدر آباد دکن میں بیٹھ کر وہاں کی جاگیر داری اور ذمہ داری کو سند جواز مہیا کر رہے ہے، اب بھلا اس سے زیادہ اپنے عہد سے بے خبری کیا ہوگی؟

میں نے سماجی علوم کو پڑھنے کے بعد بہت سنجیدگی سے قرآن کو پڑھا، میرے والد محترم نے مجھے جلالین پڑھائی تھی، وقت کے ساتھ ساتھ جلالین کی علمی گہرائی اور قرآن مجید سے آشنائی اور شناسائی کا تاثر مزید گہرا ہو رہا ہے، میں نے قرآن مجید کا حاشیہ فتح الرحمن، موضح قرآن اور دوسرے بزرگوں کے حواشی کا مطالعہ کیا، حضرت شیخ الہندؒ کے حواشی میں بہت گہرائی ہے۔ مولانا احمد علی لاہوریؒ کے حواشی بھی بہت قابلِ قدر ہیں۔ ان میں بہت سے سوالات کا جواب مل جاتا ہے، حضرت مفتی محمد شفیع عثمانیؒ کی معارف القرآن کی چند جلدیں پڑھ سکا ہوں، واقعی باکمال تفسیر ہے۔ مولانا عبیداللہ سندھی کی الہام الرحمٰن اور المقام المحمود کے دستیاب سرمائے سے سیراب ہونے کی کوشش کی۔ استاذ گرامی مولانا محمد طاہر کی سمط الدر، حضرت شیخ القرآن مولانا حسین علی الوانی کی بلغۃ الحیر ان اور تفسیرِ نظیر کمال کی کتابیں

ہیں۔قرآن مجید کی ایک عربی لغات "کلمات القرآن" کمال درجے کی کتاب ہے۔میں نے بساط بھر قرآن مجید کو سمجھنے کی کوشش کی، اس سلسلے میں میں نے متجددین کو بھی پڑھا، خصوصا اہلِ قرآن کو، مگر کم ہی اطمینان ہوسکا، قرآن مجید کے بعض انگریزی تراجم کو پڑھا، ایک دو اچھے لگے آگے، احمد علی کا ترجمہ قرآن پسند آیا۔عنایت اللہ اثری کی کتابیں پڑھیں، تعبیر وتشریح میں وہی تاویلات کا انداز ملا جو اہل قرآن کے ہاں ملتا ہے، قرآن فہمی کے سلسلے میں سید سلیمان ندویؒ کی ارضِ قرآن اور مولانا حفظ الرحمٰن کی قصص القرآن سے استفادہ کیا۔ادارہ اصلاح وتبلیغ کا درس قرآن بہت شاندار تفسیر پائی، مولانا ابوالکلام آزاد کی ترجمان القرآن سماجی علوم کے پیدا کردہ سوالوں کا جواب بھی ہے اور قرآن کی تفسیر وتفہیم بھی۔

سیرت کے حوالے سے سر سید احمد خان کی خطباتِ احمدیہ، علامہ شبلی کی سیرت النبی علمی لحاظ سے بہت اہم ہیں۔سید سلیمان ندوی کی خطباتِ مدراس بہت شاندار کتاب ہے مگر النبی الخاتم اپنی مثال آپ ہے۔مصنّف کا قلم وجد کرتے ہوئے کاغذ پر رواں نظر آتا ہے، وہ خود بھی دھمال ڈالتا ہے اور قاری کو بھی وجد میں لاتا ہے۔کتاب کیا مسلسل درود ہے، صلاۃ وسلام ہے، سیرت کے سلسلے میں ایک تحقیقی کتاب سیرت الرسول مصنفہ محمد عثمان قریشی یقینا بہت اہم ہے۔ مذہبی داستانیں اور ان کی حقیقت سیرت وسوانح پر ایک تنقیدی کتاب ہے، اسے آنکھیں کھول کر پڑھنا چاہیے۔

تاریخ اسلام پر میں نے شاہ معین الدین ندوی کی کتاب پڑھی، اچھی لگی، علامہ شبلی کی الفاروق اور عبدالسلام ندوی کی سیرت عمر بن عبدالعزیز بہت اچھی کتابیں ہیں، میں نے ان سے استفادہ کیا، میں نے محسوس کیا کہ علامہ شبلی نعمانی کی جانشینی کے سلسلے میں عموما سید سلیمان ندوی کی طرف نگاہ جاتی ہے، مگر میرے خیال میں عبدالسلام ندوی حقیقی معنوں میں شبلی کے جانشین ہے۔انہوں نے شبلی کے کام کو آگے بڑھایا، وہ کسی طرح بھی شبلی کا سایہ یا نقل نظر نہیں آتے، ان کے کام کو آگے بڑھاتے نظر آتے ہیں، ان کا اندازِ بیان اپنا ہے، ان کے علمی فیصلے اپنے ہیں، وہ شبلی سے اختلاف بھی کرتے ہیں، اتفاق بھی، وہ کسی کا سایہ نہیں ہیں۔اُن کی اپنی شخصیت ہے، وہ شعر الہند ہو یا سیرت عمر بن عبدالعزیز، ہر کہیں اپنی محنت اور ذہانت کے نقوش پیش کررہے ہیں۔ان کی کتاب امام رازی بہت اہم محسوس ہوئی۔

الملل والنحل کے سلسلے میں امام ابن حزم کی کتاب کا ترجمہ جو عبداللہ عمادی نے کیا تھا، میں نے

پڑھا ہے، مولانا محمد حنیف ندوی نے امام ابوالحسن اشعری کی کتاب "مقالات الاسلامیین" کا ترجمہ کیا ہے اور بہت اچھا مقدمہ لکھا ہے۔ میں نے یہ کتاب محنت سے پڑھی اور اچھی لگی، میں نے ناصر خسرو پڑھی اور اسماعیلیہ سے براہِ راست واقف ہوا۔ ایسے ہی میں نے زاہد علی اکبر کی کتاب ہمارے اسماعیلی مذہب اور ان کی حقیقت پڑھی اور اسماعیلیت سے واقفیت حاصل کی، یہ کتاب ادب میں علامتوں کی تعبیر کے سلسلے میں بہت مفید ہوسکتی ہے۔ تاریخ اسلام کا جو تجزیہ مولانا سندھی نے پیش کیا، وہ منفرد بھی ہے اور معقول بھی۔

فقہ میں کتابوں سے زیادہ میں نے اساتذہ کی صحبت سے فیض پایا، میرے والد اور دادا جان دیوبند کے فضلاء تھے، میرے دادا میرے والد صاحب کے بچپن میں فوت ہو گئے تھے، والد محترم نے دورہ حدیث میں حضرت انور شاہ کاشمیریؒ سے فیض پایا، وہ فقہ کی جزئیات پر گہری نظر رکھتے تھے، میں ان کی باتیں سنتا اور فقہ سے آشنا ہوتا رہا، بعد میں مجھے حضرت مولانا مفتی محمد عیسی خاں گورمانی کے در پر حاضر ہوا تو ان کی صحبت سے فیض پایا، میں نے ایک استاذ سے اصول الشاشی کے چند صفحات اور ھدایہ کے چند صفحات پڑھے، یہی میرا کل سرمایۂ علم ہے، ہاں میں نے مولانا محمد تقی امینی کی کتاب فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر، احکام شرعیہ میں احوال زمانہ کی رعایت، اجتہاد اور بعض دوسری کتب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا۔ اللہ میرے ان تمام بزرگوں کو اجر عظیم عطا فرمائے کہ میں نے ان سے فیض یاب ہو کر فقہ اسلامی میں شدبد حاصل کر لی۔ یہ میرا اعزاز ہے کہ میں نے استاذِ محترم مولانا مفتی محمد عیسیٰ خاں گورمانی علیہ الرحمہ کی کتاب افتاء اور اصول فقہ پر مقدمہ لکھا۔ فقہ میں مولانا محمد عمر عثمانی کی کتاب فقہ القرآن ایک اہم کتاب ہے۔ میں نے جلد ششم کے علاوہ تمام مجلدات کا مطالعہ کیا اور اس مجموعۂ کتب کو بہت اہم محسوس کیا۔

عربی ادب میں میں نے نفحۃ الیمین سبقاً پڑھی، سبعہ معلقہ کا ترجمہ از خود پڑھا، ایسے ہی امام بوصیری کا قصیدہ بردہ اور حضرت کعب بن زہیر کا نعتیہ قصیدہ پڑھا، عربی ادب کی تفہیم و تحسین کے لیے پروفیسر خورشید رضوی کا سلسلۂ مضامین میرے لیے بہت مفید رہا۔ ان مضامین کا ایک حصہ "عربی ادب قبل از اسلام" کے عنوان سے چھپ چکا ہے، یہ ہر لحاظ سے بہت دلچسپ اور شاندار کتاب ہے۔

اردو زبان میں علم کلام پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، اس کا باعث یہ ہوا تھا کہ انگریز پادریوں نے اسلام کو چیلنج کیا، اس چیلنج کا جواب بھی دیا گیا اور مغرب کے اعتراضات سے مطابقت پذیری کی کوشش بھی کی گئی، حضرت شاہ عبدالقادر نے موضح قرآن کے حواشی میں علم کلام پر دادِ تحقیق دی، اُن کے بعد حضرت شاہ اسماعیل شہید کی کتاب "تقویۃ الایمان" سامنے آئی، موضح قرآن اور تقویۃ الایمان کو عہد ساز کتابیں کہا جا سکتا ہے، ان کتب کے علاوہ حضرت شاہ ولی اللہ کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ کے اردو تراجم نے علم اسرار دین اور علم الکلام کو آگے بڑھایا۔ میری خوش بختی ہے کہ میں نے ان تینوں تصانیف سے استفادہ کیا۔ ان کے علاوہ مولانا عبیداللہ مالیر کوٹلوی (انت رام) کی تحفۃ الہند سے بھی مستفید ہوا۔

۱۸۵۷ کے بعد علم کلام پر بہت کام ہوا، میں نے متکلمین کو بہت دلچسپی سے پڑھا، اسی لیے میں نے "متکلمین کی اردو نثر کا تحقیقی جائزہ" کے عنوان سے پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا، میں نے حضرت نانوتوی، حضرت مولانا محمد حسن امروہی، سرسید احمد خاں، الطاف حسین حالی عنایت رسول چریا کوٹی، چراغ علی، علامہ شبلی نعمانی، مولانا ابوالکلام آزاد، سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی کی کلامی تحریروں کے نثری اسلوب کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ متجددین کے نثری اسالیب کا بھی جائزہ لیا۔

میں نے ایک عمر اردو ادب کی تاریخ و تدریس میں صرف کی، اردو زبان و ادب کا مطالعہ اور تدریس میرے مشاغل تھے، میں نے اردو تنقید میں محمد حسن عسکری کی تحریروں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا، دوسرے نقادوں میں سے ممتاز حسین، مظفر علی سید، ریاض احمد وغیرہ کو بھی پڑھا۔ نئ شاعری کی تحریک کے نقادوں میں سے انیس ناگی بھی میرے زیرِ مطالعہ رہے، جیلانی کامران اور محمد علی صدیقی کو بھی میں نے شوق اور محنت سے پڑھا۔

میں نے آپ بیتی اور خاکہ نگاری کو بہت شوق سے پڑھا، میرے پاس اردو آپ بیتی اور خاکوں کا ایک بڑا ذخیرہ ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میرے پاس جمع ہونے والی آپ بیتیوں اور خاکوں کے مجموعوں کا اس قدر بڑا ذخیرہ ہے کہ اسے پاکستان کے دس بڑے ذخائر میں سے ایک کہا جا سکتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ میں نے یہ کتابیں صرف جمع نہیں کیں، اُنہیں پڑھا بھی ہے۔ سرسید احمد خاں اور غالب پر بھی میں نے اچھی خاصی تعداد میں کتابیں جمع کر رکھی ہے اور ان میں پڑھنے سمجھنے کی کوشش بھی

کی ہے، اسی طرح میں نے اقبالیات پر بھی اچھی خاصی کتب جمع کی ہیں، مگر یہ کتاب پڑھنے کے بعد بہت مایوسی ہوئی ہے۔ ان میں آزادانہ تجزیہ نہیں ہے، عقیدت نے عقیدے کی شکل اختیار کر لی ہے، اس موضوع پر جرأت سے کوئی بات کہنا بہت جرأت طلب ہے۔

میں نے انتظار حسین، قرۃ العین حیدر، عبداللہ حسین، نذیر احمد، فضل احمد کریم فضلی، مستنصر حسین تارڑ، کرشن چندر، خدیجہ مستور، عزیز احمد، فاروق خالد، شمس الرحمن فاروقی کے ناول محنت اور شوق سے پڑھے۔ جدید شعرا میں نے فیض مجید، امجد اور راشد کو پڑھا۔ منیر نیازی، افتخار عارف اور اظہار الحق اچھے لگے، مگر ظفر اقبال اور ثروت حسین ہمارے عہد کے وہ شعراء ہیں جن کو بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ ظفر اقبال کو اس کی کثرت اور وسعت کے باعث مکمل طور پر پڑھنے سے محروم ہوں، البتہ ثروت حسین کو چند ایک بار پڑھ سکا ہوں اور ہر بار ایک نیا لطف لیا ہے۔

میں نے چند ایک سفرنامے بھی پڑھے ہیں اور چند ایک افسانہ نگاروں کو بھی پڑھ سکا ہوں۔

رسائل میں نے سویرا، فنون، اوراق، دنیا زاد کو محبت اور شوق سے پڑھا، علمی رسائل میں سے الحق اور برہان کے بعض شمارے معارف کے چند شمارے اور خوش وقت ہوا۔

میں نے اپنے کالج کے اساتذہ سے مطالعہ کا شوق پایا، میرے پسندیدہ موضوعات تھے: ادب، سیاسیات اور مذہب۔ سیاسیات میں آگے جا کر تاریخ بھی شامل ہوگئی اور کسی حد تک معاشیات بھی۔ میرے قرآن کے اساتذہ مولانا محمد طاہر اور مولانا مفتی محمد عیسی رحمۃ اللہ علیہما اور میرے والدِ محترم نے میری رہنمائی فرمائی۔

پسندیدہ رسائل میں مزید فنون، نقوش، مکالمہ، استعارہ، ادبِ لطیف، برہان، الحق، اورینٹل کالج میگزین، اردو، قومی زبان وغیرہ۔ پسندیدہ افسانہ نگار انتظار حسین ہیں، پسندیدہ کالم نگار احمد ندیم قاسمی، عطاالحق قاسمی اور ابن انشاء ہیں، پسندیدہ مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی، ابن انشا اور رشید احمد صدیقی ہیں۔

میں عموماً شام کے بعد مطالعہ کرتا رہا ہوں، دورانِ سفر بھی مطالعہ کرتا ہوں، رفتار کا کچھ نہیں کہہ سکتا۔

نئے لکھاری آوارہ خوانی کریں، پھر امہات کتب کو پڑھیں، پھر انہیں خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ وہ کیا پڑھیں۔

علم و تحقیق

لفظ "کمال" کا کمال

آصف جیلانی

یکم دسمبر ۱۹۶۵ء کو جب میرا بی بی سی لندن کی اردو سروس سے رشتہ استوار ہوا تھا تو اُس وقت زبان کے لحاظ سے امجد علی صاحب اور خالد حسن قادری صاحب نہایت مقتدر ماہر مانے جاتے تھے جن سے میں نے براڈ کاسٹنگ کے ہنر کے علاوہ زبان کے معاملہ میں بھی فیض حاصل کیا۔

شام کو پروگرام سے فارغ ہو کر کینٹین میں خالد حسن قادری صاحب کے ساتھ بیٹھ کر اردو کے الفاظ کے جادو اور اسرار و رموز پر گفتگو رہتی تھی اور بات سے بات نکلتی تھی۔ ایک شام پروگرام میں مارک ٹلی کے تبصرے کے بارے میں مَیں نے کہا کہ بڑے کمال کا تبصرہ تھا۔ قادری صاحب نے اپنے خاص دھیمے انداز سے قہقہہ لگایا اور کہا کہ یہ "کمال" کا لفظ بھی بڑے کمال کا لفظ ہے۔ کہنے لگے کہ لفظ کمال کے معنی بھی مختلف ہیں۔ مثلاً پورا ہونا، ہنر، لیاقت اور اس کے ساتھ عجیب کام، انوکھی بات، عمدگی، استادی اور کاریگری وغیرہ۔ میں نے پوچھا کوئی سند کوئی مثال؟۔ قادری صاحب نے بغیر کسی توقف کے کہا، فرہنگ آصفیہ کے مولف، مولوی سید احمد صاحب دہلوی نے تشریح کے طور پر یہ مصرعہ درج کیا ہے۔ "کمال افسوس ہے مجھ پر کمال افسوس ہے"۔ پھر کہنے لگے داغ دہلوی کا شعر ہے:

ہزار کام مزے کے ہیں داغ الفت میں
جو لوگ کچھ نہیں کرتے کمال کرتے ہیں

قادری صاحب کہنے لگے کہ یہاں کمال طنز کے طور پر استعمال کیا گیا ہے، یعنی اچھا کام نہیں کرتے۔

اس دوران امجد علی صاحب بھی اپنی چائے لیے میز پر آ گئے۔ پوچھنے لگے کہ کس بات پر گفتگو ہو رہی ہے؟ میں نے عرض کیا کہ الفاظ کے جادو پر بات ہو رہی ہے۔ میں نے امجد علی صاحب سے کہا: اچھا ہوا آپ بھی آ گئے۔ مجھے یہ تو معلوم ہے کہ "اکل کھرا" سخت مردم بے زار شخص کو کہتے ہیں لیکن ایک عرصہ سے سوچ رہا تھا کہ اس لفظ کی وجہ تسمیہ کیا ہو سکتی ہے؟ اپنے خاص انداز میں مسکراتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اصل میں تنہا اور اکیلے بیٹھ کر کھانے والے کو فارسی میں تنہا خور کہتے ہیں یعنی اکیلا اور اکیلا بیٹھ کر کھانے والا، اور یہ دلچسپ بات ہے کہ اردو میں "اکل" کھانے یا غذا کو کہتے ہیں اور اکل اکیلے اور تنہا کو بھی کہتے ہیں۔ یوں تنہا خور آدمی کو جو ایک کونے میں بیٹھ کر اپنا پیٹ بھرتا ہے اور پڑوسیوں کو خبر نہیں ہونے دیتا، بدمزاج اور تندخو "اکل کھرا" کہا جانے لگا۔ یہ مثل مشہور ہے، اکل کھرا جگ سے بُرا۔

میں خالد حسن قادری صاحب کی طرف متوجہ ہوا اور کہا کہ اب جب کہ کھانے پینے کی بات چل نکلی ہے، یہ بتایے کہ اس کہاوت کے پیچھے کیا کہانی ہے، "شوربا حلال بوٹی حرام"۔ کہنے لگے انگریزوں کے دور میں ایک بزرگ کی چھوٹی بہن نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا۔ وہ بہت برہم ہوئے مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد بہن نے اپنے بڑے بھائی کو کھانے کی دعوت دی۔ بزرگ پس و پیش میں پڑ گئے لیکن بہن کے اصرار پر بہن کے ہاں چلے گئے۔ میز پر کھانا چنا گیا۔ سالن میں صرف قورما تھا اور بھوک شدت کی تھی۔ بزرگ نے کھانا شروع کیا۔ سالن میں بوٹی کو ہاتھ نہیں لگایا۔ شوربے سے روٹی کھاتے رہے۔ بہن نے کہا بھائی صاحب یہ تو ذبیحہ ہے۔ بھائی نے بہانہ بنایا کہ کئی روز سے میرے مسوڑوں میں درد ہے۔

بزرگ کھانا کھانے کے بعد گھر واپس آ گئے۔ وہاں ان کے دوست بھی آ گئے اور دعوت کا ماجرا پوچھا۔ کہنے لگے میں کرسٹان ہوتے ہوتے رہ گیا۔ دوستوں نے پوچھا: وہ کیسے؟ فرمانے لگے: ارے بھئی سور کا گوشت حرام ہے۔ بہن کی دل آزاری بھی گناہ ہے۔ ہم نے گوشت کی بوٹی کو ہاتھ نہیں لگایا صرف شوربے سے روٹی کھائی۔ دوستوں نے کہا: کیا کہنے "شوربہ حلال اور بوٹی حرام"۔

میں نے کہا کہ یہ بزرگ بڑے استاد نکلے۔ امجد صاحب بولے یہ استاد کا لفظ بھی اردو میں خوب

آیا ہے۔ زرتشت کی مرقومات کا مجموعہ "اوستا" کہلاتا ہے۔ "اوستا" نہایت قدیم ایرانی زبان میں ہے جس کو سمجھنے والے بہت کم ہیں۔ چنانچہ جو حضرات "اوستا" ماہر ہوتے تھے ان کو استاد کہا جانے لگا۔۔ استاد بڑی عزت واحترام کا لفظ تھا لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا گیا، اس کا رتبہ بھی کم ہوتا گیا۔ پہلے یہ لفظ عالم کے لیے اور تعلیم دینے والے کے لیے استعمال ہوتا تھا مگر بعد مین ہر فن کے ماہر کو استاد کہا جانے لگا، یہاں تک کہ گانے والوں اور سرانگی نوازوں کو بھی استاد کہا جانے لگا۔ اور اب استاد چلتے پرزے اور چالاک کو کہا جاتا ہے۔

مجھے شوربے کے ذکر پر یہ کہاوت یاد آئی: "دمڑی کا شوربا اور چوہے کی دم" میں نے قادری صاحب سے پوچھا کہ اس کہاوت کے پیچھے کیا کہانی ہے۔ کہنے لگے بڑی دلچسپ کہانی ہے۔ ایک افیونی تھے۔ بیشتر وقت افیون کے نشہ میں رہتے تھے اور ان کی بیوی بھی ان کا کوئی خیال نہیں رکھتی تھی۔ ایک دن افیونی جب صبح دیر سے اٹھے تو ان کی بیوی سو رہی تھی۔ انہوں نے بیوی سے کہا کہ بہت دیر ہوگئی ہے، سخت بھوک لگی ہے۔ بیوی تنگ آ کر بولی: آج میں دیر سے اٹھی ہوں تو اتنا شور مچا رہے ہو۔ جاؤ نان بائی سے شوربا لے آؤ۔ روٹی تو ایک آدھ ڈلیا میں پڑی ہے۔

افیونی نے بیڑی سلگائی اور کھانستے ہوئے اٹھے اور پیالہ لیا اور نان بائی کے ہاں پہنچے۔ کہنے لگے پہلوان اس پیالے میں دمڑی کا شوربا ڈال دینا۔ گھر پہنچے تو بیوی سے کہا کہ لو بڑے مزے کا سالن ہے، تم کھا لو میں کارخانے میں چائے پاپے منگا لوں گا۔ افیونی کارخانے چلنے کے لیے تیار ہوئے تو بیوی کے چیخنے کی آواز آئی، میاں یہ کیسا شوربا اٹھا لائے۔ افیونی نے پوچھا کہ کیوں کیا بات ہے۔ بیوی نے کہا کہ اس میں چوہے کی دم نکلی ہے۔ افیونی کو بہت غصہ آیا اور نان بائی کے ہاں پہنچے اور کہنے لگے کہ پہلوان دوستی پر لات ماردی۔ پہلوان نے پوچھا کہ کیا ہوا۔ افیونی بولے شوربے میں چوہے کی دم نکلی ہے۔ میری بیوی بہت غصہ میں ہے۔ نان بائی نے کہا: میرے بھائی! اپنی بیوی سے بولو کہ کیا دمڑی کے شوربے میں ہاتھی کی دم نکلے گی؟ ویسے تم تو میرے یار ہو۔ ایک پیالہ شوربا اور لے جاؤ۔ دمڑی کے اسی شوربے کے ذکر پر محفل برخاست ہوگئی۔

تعلیم وتربیت

شرعی حجاب عقل ونقل کی نظر میں

مفتی صدیق احمد

زمانۂ جاہلیت میں ظلم وتشدد، عصیان ونافرمانی، بے حیائی اور فحاشی عروج پر تھی، بے جا رسم ورواج کا خوب چلن تھا، عورتوں کی پیدائش کو معیوب سمجھا جاتا تھا، کہیں تو زندہ درگور کردیا جاتا اور کہیں زندہ تو رکھا جاتا لیکن اس پر جبر واستبداد کے پہاڑ توڑے جاتے، چھوت چھات کا معاملہ حد سے بھی آگے بڑھ گیا تھا۔ ایسے تاریک دور میں لوگوں کو گھٹا ٹوپ تاریکی سے نکال کر روشنی کی طرف لانے کے لیے اسلام کی آمد ہوئی، اسلام نے ہر ایک کو مہذّب زندگی جینے کا سلیقہ سکھایا، شرم وحیا کی چادر اوڑھنے کا طریقہ بتایا اور مرد وعورت ہر ایک کے جسم کے مخصوص حصے کو چھپائے رکھنے کا حکم دیا، تاکہ بے حیائی اور فحاشی پر روک لگ سکے۔ مرد وعورت ہر ایک کو قابلِ احترام سمجھا، عورتوں کو عزت کے اعلیٰ مقام پر فائز کردیا، بیٹی ہو تو رحمت، بیوی ہو تو عزت اور ماں ہو تو جنت کا اعزاز عطا کیا۔ جیسے جیسے اسلام پھیلتا گیا انسانی زندگی کو سنوارنے دین اور دنیا بنانے کے لیے بہ تدریج احکام الٰہیہ کا نزول ہوتا رہا، معاشرے میں رائج برائیوں پر دھیرے دھیرے روک لگتی گئی، اسی عرصے میں ایک اہم حکم حجاب (پردہ) ۵ھ میں اترا، جو کہ عورتوں کو فتنے سے بچانے کے لیے بہت ہی مؤثر تھا۔

حجاب کے معنی پردہ، اوٹ، نقاب اور ڈھانکنے کے ہیں، جو کہ مرد وعورت ہر ایک کی عزت و ناموس کی حفاظت کے لیے عقلی، نقلی، فطری اور طبعی اعتبار سے اہم اور ضروری ہے، البتہ فرق صرف

اتنا ہے کہ مرد وعورت کے اعضائے مستورہ کی حد الگ الگ ہے: ستر العورۃ واجب علی کل حال (المبسوط للسرخسی ۲/ ۵۹) حصۂ ستر کا چھپانا واجب ہے ہر حال میں۔ عورۃ الرجل مابین سرتہ الی رکبتیہ (المبسوط للسرخسی ۱۰/ ۱۴۶) مرد کا حصۂ ستر ناف سے گھٹنوں تک ہے۔

معلوم ہوا کہ سترِ عورت کا فریضہ حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ کے جنت میں رہنے سے لے کر دنیا میں آنے کے بعد اور اس کے بعد سے تمام ہی انبیاء علیہم السلام کی شریعت میں فرض رہا۔ البتہ عورتوں کو پردے میں رہنے کا حکم ۵ھ میں نازل ہوا۔

حجاب ابتدائی دور سے آج تک: ابتدائی زمانے میں سلے ہوئے لباس نہیں پہنے جاتے تھے، بلکہ دو کپڑوں کا استعمال ہوتا تھا، جن میں سے ایک تہبند اور دوسرا قمیص کے طور پر بدن پر رکھا جاتا تھا، پھر زمانہ برق رفتاری سے آگے بڑھتا گیا، لباس میں بھی بہ تدریج تبدیلی آتی رہی، سلے ہوئے موٹے ڈھیلے ڈھالے لباس پہنے جانے لگے، اب سلے ہوئے کپڑوں کی الگ الگ شکلیں متعارف ہوئی، جس کی وجہ سے بدن کو چھپانا اور بھی آسان ہوگیا، رفتہ رفتہ یہ معاملہ آگے بڑھ گیا اور لوگ سہولت پسندی، فیشن پرستی پر اُتر آئے، لہٰذا اب نئے نئے منقّش، مزیّن برقعے، قمیص اور پوشاک بازار میں دستیاب ہونے لگے، لوگوں کی ذہنیت، سوچ اور فکریں بدلتی گئیں، حتی کہ لباس، پوشاک، برقع ضرورت سے نکل کر اب زیب وزینت کا مَظہَر بن گیا اور اس طرح لباس نے اپنی مقصدیّت کھودی، چونکہ ایسے جاذبِ نظر اور تنگ برقعے پہنے جانے لگے کہ ہر ایک کی نظر اس کی طرف لگی رہ جائے، کوئی دیکھے تو بس دیکھتا ہی رہ جائے، حالاں کہ ایسے برقعے کا استعمال اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہے، شریعت کے احکام کی خلاف ورزی ہے، جس سے اجتناب از حد ضروری ہے۔

واقعی یہ بات مسلَّم ہے کہ جس میں جتنی حیا ہے وہ اتنا ہی حجاب کرتا ہے اور جو جتنے بے حیا ہیں، وہ اتنے ہی ننگے پھرتے ہیں۔

دراصل حجاب کا مقصد حیا، پاکدامنی، عورتوں کی عزت وناموس کی حفاظت، چال، ڈھال اور جسم کی ساخت کو چھپائے رکھنا ہے، تاکہ جنسی بھیڑیوں کی شہوت انگیز نظریں متلذّذ ہو کر شیطانی تیر کا

نشانہ نہ بن سکے۔ یہ سارے مقاصد اسی وقت حاصل ہوں گے جب کہ حجاب شرعی، ڈھیلے ڈھالے، جسمانی ساخت کو چھپائے رکھتے ہوں اور چال، ڈھال، مواضعِ زینت کو پردۂ خفا میں رکھتے ہوں، ورنہ حجاب اور پردے کی مقصدیّت فوت ہوجائے گی۔

حجاب کا ثبوت: شرعی اعتبار سے آیات قرآنیہ کی روشنی میں پردے کا ثبوت سورۃ الاحزاب کی چار آیتوں: ۳۳، ۵۳، ۵۵، ۵۹ اور سورۃ النور کی تین آیتوں: ۳۰، ۳۱، ۶۰ سے ہے، اس سلسلے میں حدیث کی ستر ۷۰ روایتیں بھی وارد ہوئی ہیں، ان تمام کی روشنی میں فقہا کرام نے لکھا ہے کہ: شرعی پردہ کے تین درجے ہیں: (۱) ادنی (۲) اوسط (۳) اعلی۔

(۱) ادنی درجہ: چہرہ، ہتھیلیوں کے علاوہ اور بعض کے نزدیک پیروں کے علاوہ بھی باقی تمام بدن کو کپڑے سے چھپایا جائے۔

دلیل: ولا یبدین زینتھن الا ما ظھر منھا (النور ۳۱) وفسر بالوجہ۔ ترجمہ: اور اپنی زینت ظاہر نہ کریں مگر وہ جو اس میں سے ظاہر ہوجاتی ہو۔ اور اس کی تفسیر کی ہے چہرے سے۔

(۲) اوسط درجہ: پورے بدن کو یعنی چہرہ، ہتھیلیوں اور پیروں کو بھی برقع سے چھپایا جائے۔

دلیل: یدنین علیھن من جلابیبھن (الاحزاب ۵۹) ترجمہ: وہ اپنے چہرے پر اپنی چادر کا کچھ حصہ لٹکائے رکھیں۔

(۳) اعلیٰ درجہ: عورت دیوار یا پردے کے پیچھے آڑ میں اس طرح رہے کہ اس کے کپڑوں پر بھی اجنبی مردوں کی نظر نہ پڑے۔

دلیل: وقرن فی بیوتکن (الاحزاب ۳۳) ترجمہ: اور اپنے گھروں میں ٹھہری رہو۔ واذا سألتموھن متاعا فسئلوھن من وراء حجاب (الاحزاب ۵۳) ترجمہ: اور جب امہات المؤمنین سے تمہیں کوئی چیز مانگنی ہو، تو پردہ کے پیچھے سے ان سے سوال کرو۔ المستفاد امداد الفتاوی۔

چہرہ ڈھانکنے کی عقلی دلیل: عورت کا چہرہ ہی وہ پُرکشش جگہ ہے جس پر نظر پڑنے کے بعد خیالات کا ہجوم اُمنڈ آتا ہے اور یوں آنکھوں سے زنا کی شروعات ہوتی ہے، پھر یہ سلسلہ دراز ہوتا رہتا

ہے اور شرمگاہ کو بھی زنا میں ملوث کر دیتا ہے، اسی لیے اسے ڈھانکنے کا حکم دیا، تاکہ زنا کے اسباب سے بھی بچا جاسکے۔

قرآنی آیت یدنین میں ادنی کے لغوی معنی قریب کرنا لیکن جب علی صلہ آئے تو اس کا معنی ہوتا ہے لٹکانا اور یہ اسی وقت متحقق ہوگا جب کہ چہرہ ڈھکا جائے۔

مشاہدہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آج کل شادی کے لیے اگر کوئی لڑکی دیکھنے جاتا ہے تو چہرہ لازمی دیکھا جاتا ہے، خواہ جسم دکھے یا نہ دکھے، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ پورا جسم دیکھا ہو اور چہرہ نہ دیکھا ہو، لہٰذا مشاہدہ بھی اس بات کی تائید کرتا ہے کہ چہرہ کا بھی پردہ ہونا چاہیے۔

حجاب کے فائدے: پردے سے عورت کی عزت وناموس کی حفاظت ہوتی ہے، نسب محفوظ رہتا ہے، پردے کی وجہ سے نظر، حسن اور دل کی پاکیزگی حاصل ہوتی ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے، معاشرہ پاکیزہ رہتا ہے، نیکی کا شوق پیدا ہوتا ہے اور تقویٰ والی زندگی نصیب ہوتی ہے، باحجاب عورت شیطان سے محفوظ رہتی ہے، حجاب بہت سے فتنے اور گناہوں سے بچالیتا ہے۔

بے حجابی کے نقصانات: بے پردہ عورت اللہ تعالیٰ کی غیرت کو للکارتی ہے اور ہر وقت اللہ تبارک وتعالیٰ کی ناراضگی میں رہتی ہے۔ ایسی عورتیں جلد فتنے میں پڑ جاتی ہیں، دنیا میں بھی ان کے نسب کی حفاظت مشکل ہوجاتی ہے اور رسوائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، بے پردہ عورت کی صحت خراب ہوجاتی ہے، چونکہ وہ جلد عشق ومعاشقہ میں گرفتار ہوجاتی ہے، اور مرنے کے بعد بھی بے پردہ عورت عذاب قبر میں مبتلا رہتی ہے۔

اس وقت ضرورت ہے کہ اسلامی تعلیمات کو خوب عام کیا جائے اور دین کے تمام احکام پر عمل کرنے میں تصلّب (سختی اور مضبوطی) سے کام لیا جائے، معاشرے کی بیٹیوں کو ہمیشہ باحجاب رہنے کی تلقین کی جائے، مذہبی تعلیم کو مقدم رکھتے ہوئے اسے اولیں ترجیح دی جائے۔

☆......☆......☆

یادگارِ زمانہ

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ - بحیثیت ناقد
مختصر جائزہ

مولانا نعیم الرحمن صدیقی ندوی

مولانا دریابادی نے اپنی حیات مستعار کی آخری ۴ دہائیاں اسلامیات کے فروغ، تبلیغ واشاعت کے لیے وقف کردی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس عرصے میں ادبیات اور انتقادیات میں اتنی دلچسپی نہ لے سکے جتنی وہ اس سے پہلے لیتے تھے، اس کے باوجود ادب وتنقید میں ان کی خدمات بہ لحاظ کیفیت نظر انداز نہیں کی جاسکتی ہیں۔ ان کی تنقیدی تحریروں میں تخلیقی شان پائی جاتی ہے۔ ان کی تنقید میں ذوقی، وجدانی اور شاعرانہ رجحانات موجود ہیں۔

مولانا دریابادی نے جس زمانے میں تنقیدی مضامین لکھے، اس وقت اردو تنقید کے دبستان وجود میں نہیں آئے تھے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کے الفاظ میں:

> ''مختلف نقادوں کی تحریروں پر جمالیاتی، تاثراتی، نفسیاتی، اخلاقی، مادی اور افادی تصورات کی چھاپ نظر آتی تھی لیکن انہیں کسی خاص دبستان کا نمایندہ قرار دینا ناممکن بھی تھا اور نامناسب بھی۔ ان معنوں میں ماجد بھی کسی خاص دبستان سے وابستہ نہیں کیے جاسکتے۔ البتہ ان کے مضامین پر جمالیات، تاثرات، نفسیات اور اخلاقیات کے چھینٹے بہت گہرے ہیں اور سب سے اہم بات ان کا منفرد اسلوب تحریر ہے جس کے باعث وہ اپنے مضامین کے لیے ''انشاء'' کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں''۔ (عبدالماجد دریابادی - احوال وآثار ص ۱۱۸)

پروفیسر سید احتشام حسین، پروفیسر نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر عبادت بریلوی اور ڈاکٹر تحسین فراقی نے مولانا دریابادی کے تنقیدی اکتسابات کا جائزہ لے کر انتقادیات میں ان کا درجہ و مرتبہ متعین کیا ہے۔

نام ور ناقد پروفیسر سید احتشام حسین (متوفی ۱۹۷۲ء) سابق صدر شعبہ اردو الہ آباد یونی ورسٹی نے آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن، نئی دہلی کی فرمائش پر مولانا دریابادی سے ان کی ادبی زندگی کے متعلق ایک طویل انٹرویو لیا تھا جو ۸ / جون ۱۹۶۰ء کو نشر ہوا۔ اس میں مولانا دریابادی نے اپنے تنقیدی نظریات و رجحانات کے متعلق یہ وضاحت کی:

پروفیسر صاحب کا سوال:

"آپ کے مضامین کے مطالعے سے کبھی کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ آپ ادبی اقدار کو اخلاقی اقدار کے تابع رکھنا چاہتے ہیں، یا کم سے کم اس کے بغیر ادب کو قابل تحسین نہیں سمجھتے۔ اگر ایسا ہے تو کیا آپ ادب میں کسی خاص طرح کی مقصدیت یا افادیت کے قائل ہیں؟"

مولانا نے جواب دیا:

"تری آواز مکے اور مدینے۔ صحیح سمجھے آپ! مذہب جب سے سمجھ میں آیا، اس کی ہمہ گیری، اس کی جان داری بھی سمجھ میں آ گئی۔ ادب کی تکمیل بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ ادب صالح وصحت مند وہی جو صحیح مذہبیت کے تحت میں ہو"۔

پروفیسر موصوف نے ایک اور سوال کیا:

"آپ کی ذہنی تعمیر میں تو فلسفہ، منطق اور نفسیات کا کافی ہاتھ رہا ہے، پھر آپ نے فلسفہ ادب یا فلسفۂ تنقید جیسے مسائل کی طرف توجہ کیوں نہیں کی؟ یا آپ تنقید کے معاملے میں سرے سے نظریے اور نقطۂ نظر کے مخالف ہیں؟"

مولانا نے جواب دیا:

جی ہاں! اب یاران طریقت نے تنقید کو ایک مستقل فن بنالیا ہے۔ شاخ در شاخ اور پیچ در پیچ، اور نقادی کو ایک پیشہ ٹھہرالیا ہے۔ میں اتنا دماغ کہاں سے لاؤں اور اپنی زبان کی ترکیب و ترتیب فرنگی سانچے میں کیسے فٹ کرلوں؟ میرے جی کو تو وہی سیدھی سادی روش

مولانا شبلی اور حسرت موہانی کی لگتی ہے اور مرزا ہادی رسوا کا یہ قول نہیں بھولتا کہ ''بھئی میں تو غالب کا عاشق رہا ہوں۔ مدتوں دیوان غالب سرہانے رکھ کر سویا ہوں لیکن جو شعر پہلی مرتبہ سمجھ میں نہ آیا، اسے دوبارہ نہ پڑھا۔ یہ سمجھ لیا کہ یہ میرے لیے نہیں۔ شعر پر جب غور کرنا پڑا تو وہ فلسفہ ہو گیا، شعر کہاں رہا''۔

(نشریات ماجدی، ۱۵۶، ۱۵۷)

مولانا دریابادی نے علامہ شبلی نعمانی کی کتاب ''الکلام'' پر استدلالی اور منطقی انداز میں مفصل تنقید کی، جو ماہنامہ الناظر لکھنؤ کے مارچ ۱۹۱۰ء سے جنوری ۱۹۱۱ء کے شماروں میں ۶/ قسطوں میں شائع ہوئی۔ مولانا دریابادی کی یہ اولین تنقیدی تحریر تھی۔

مولانا کے تنقیدی مضامین ان کی کتاب ''انشائے ماجد'' اور ریڈیائی تقریروں کے مجموعے ''نشریاتِ ماجد'' میں موجود ہیں۔

پروفیسر احتشام حسین مولانا دریابادی کی تنقیدی بصیرت کا اعتراف یوں کرتے ہیں:

''مولانا عبدالماجد دریابادی کی تنقیدی بصیرت پر نگاہ کرتے وقت اس بات کا یاد رکھنا ضروری ہے کہ ایک ادیب کے نقطہ نظر کی تشکیل میں وہ سارے عناصر کام کرتے ہیں جو نقاد کے ذہن پر چھائے رہتے ہیں۔ انہوں نے مذہبیات، علوم اخلاق، نفسیات، سماجی محرکات، تاریخ افکار، تصوف، ادبیات اور شخصیات ہر ایک سے گہری دل چسپی لی ہے۔ مطالعے کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا ہے۔ طالب علمانہ دور چھوڑ کر تقریباً ساٹھ سال سے یہ مشغلہ غور وفکر کے ساتھ جاری ہے اور اس کے عملی نتائج ہزارہا صفحات کی شکل میں بکھرے ہوئے ہیں، جن کے تنوع کا یہ حال ہے کہ اگر اس میں ایک طرف زود پشیماں ہے تو دوسری جانب تفسیر ماجدی، ایک جانب ہلکے پھلکے موضوعات پر نثری مضامین کا سلسلہ تو دوسری جانب تصوف اسلام، ایک طرف فلسفہ اجتماع ہے تو دوسری طرف مختصر تبصرے اور کتابوں کے پیش لفظ۔ ان سب کے اندر ایک ہی روح کارفرما ہے۔ ایک خاص طرح کی تنقیدی بصیرت جو تاثراتی اور شخصی ہوتے ہوئے بھی استدلالی رنگ رکھتی ہے۔ اپنی بات کہنے کے

جوش میں حقائق کو نظر انداز نہیں کرتی اور جہاں تک ادب کا تعلق ہے، اس کے اخلاقی پہلوؤں پر زور دیتے ہوئے بھی تخلیق کے ادبی جمالیاتی حسن پر بھرپور نگاہ ڈالتی ہے۔اس کی بہت اچھی مثال مرزا شوق کی زہر عشق اور مرزا ہادی رسوا کی امراؤ جان ادا پر ان کے خیالات ہیں۔ دونوں تخلیقات کے موضوع وہ نہیں ہیں جن کی طرف مولانا عبدالماجد پسندیدگی کی نظر ڈالیں لیکن جب ان کے فنی اور ادبی محاسن کے ساتھ انصاف کرنے کا وقت آیا تو انھوں نے بخل سے کام نہیں لیا اور ان پہلوؤں کی داد دی جس کی وہ بجا طور پر مستحق تھیں''۔

(ص:۹۹،۱۰۰، ماہ نامہ فروغ اردو لکھنؤ، مولانا عبدالماجد دریابادی نمبر اگست تا اکتوبر ۱۹۷۱ء)

پروفیسر مزید تحریر کرتے ہیں:

''اردو میں شاذ و نادر ہی ایسے ادیب ہوں گے جن کے یہاں قرآن وحدیث، تصوف و اخلاق، فلسفہ ونفسیات، سوانح وسیرت، سفرنامہ اور ڈائری، سیاسی موضوعات اور سماجی مسائل، شاعری اور تخلیقی نثر، افراد اور تحریکات کے متعلق بے تکلفی اور ادبی لطافت کے ساتھ اظہار خیال میں تازگی، لطف زبان، نشتریت اور بلاغت بھی ہو۔ یہ ساری خوبیاں مولانا عبدالماجد دریابادی کی تحریروں میں پائی جاتی ہیں''۔(ص:۹۷،۹۸)

پروفیسر موصوف اسی مضمون کے آخر میں رقم طراز ہیں:

''مختصر یہ کہ مولانا عبدالماجد دریابادی کی جو تنقیدی نظر ریاضت سے ہاتھ آئی ہے، اس میں مطالعہ، ذہانت، ذوق سلیم، قدرت بیان اور صحیح ادبی مزاج کی آمیزش نے ایسی انفرادی شان پیدا کی ہے جسے تخلیقی تنقید کے دائرے میں رکھا جا سکتا ہے۔ بہت سے دوسرے علمی کاموں سے قطع نظر مولانا اپنے ادبی اسلوب کی وجہ سے بھی زندہ رہیں گے''۔(ص:۱۰۵)

معروف محقق اور ادیب ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی (متوفی ۲۰۰۰ء)مولانا دریابادی کے تنقیدی خصائص کے متعلق تحریر کرتے ہیں:

''ادبیات میں مولانا کی دل چسپی تنقید سے زیادہ رہی ہے، ویسے جوانی میں کچھ شعرو

شاعری بھی کی ہے۔ایک ڈراما بھی لکھا ہے لیکن جلد ہی تخلیقات سے انتقادیات کی طرف آ گئے اور تنقید میں بھی بیشتر آپ کا انداز تقریظی یا تعریضی ہوتا ہے اور اس میں تفصیل کے بجائے کوشش اس کی رہتی ہے کہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مفاہیم آ جائیں۔ بعض اوقات بعض ادبی کارناموں کی شوخ اور رنگین عبارتوں کی بھی اس انداز میں تعریف کی ہے کہ خود مولانا کے اندر رندا سیر، اپنی وہ زنجیریں توڑتا نظر آنے لگتا ہے جو محتسب مذہبی نے اس کے گرد لپیٹ رکھی ہیں''۔(ملاحظہ ہو ص: ۱۰۴ حوالہ سابق)

مولانا دریا بادی کی تنقیدی خصوصیات اور نظریات کا ذکر مشہور ناقد ڈاکٹر عبادت بریلوی (م ۱۹۹۸ء) یوں کرتے ہیں:

''انہوں نے چند تنقیدی مضامین اور تبصرے بھی لکھے ہیں، جو ''مضامین عبدالماجد دریا بادی'' اور ''مقالات ماجد'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔انہی مضامین اور تبصروں سے ان کے تنقیدی خیالات کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔

مولانا عبدالماجد پر مذہب کا اثر بڑا گہرا ہے، وہ بغیر مذہب کا سہارا لیے ہوئے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھتے۔ مذہب کے اسی گہرے اثر کا نتیجہ ہے کہ وہ ایسی باتوں کی طرف زیادہ راغب ہوتے ہیں جن کی نوعیت ماورائی اور مابعد الطبیعاتی ہوتی ہے۔ وہ ہر چیز کا رشتہ عالم بالا سے جوڑ دینا چاہتے ہیں۔ چناں چہ یہ خصوصیت ان کے نظریہ شاعری میں بھی نظر آتی ہے''۔

(اردو تنقید کا ارتقاص ۲۷۰)

''۔۔۔ان کی عملی تنقید سے یہ پتا ضرور چلتا ہے کہ وہ شاعری میں تخیل، طرز ادا، لطف زبان، خیال کی ندرت، ترکیبوں کی صفائی اور جدت کے عناصر کو تلاش کرتے ہیں۔ان کی خواہش ہے کہ شاعری میں کوئی پیغام ضرور موجود ہے۔ یہ خصوصیت اس کے مرتبہ کو بڑھا دیتی ہے۔

ان کی عملی تنقید میں دوسرے نقادوں کی طرح مشرقی رنگ غالب ہے۔اگر چہ مغربی ادبیات سے اچھی طرح واقفیت رکھتے ہیں لیکن اپنے اندازِ تنقید کو انہوں نے پوری طرح

مشرقی بنایا ہے، جو چیزیں انہیں پسند آئیں ہیں وہ ان کی تعریف بھی کرتے ہیں''۔

(ص ۱۷۲)

ممتاز ناقد ڈاکٹر تحسین فراقی نے اپنے تحقیقی مقالے میں مولانا دریابادی کے تنقیدی شعور، نظریات اور اکتسابات کا نہ صرف جائزہ لیا بلکہ مفصل محاکمہ بھی کیا ہے۔ وہ مولانا کی تنقید کے محاسن بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''خود ماجد کے اسلوب تنقید کو دیکھا جائے اور ان کے موضوعاتِ تنقید پر نظر کی جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ ان کی تنقید سادگی، سلاست، شگفتگی اور جدت ادا کی حامل ہے اور ان کے موضوعات ادق اور فلسفیانہ نہیں۔ وہ تنقید میں پے چیدہ تحلیلی اور تجزیاتی اسلوب سے کام نہیں لیتے۔ وہ کسی فن پارے میں سادگی، بے تکلفی، برجستگی، سلاست، صداقت، اخلاق آموزی اور عبرت انگیزی کے عناصر تلاش کرتے ہیں۔ وہ اسے سوقیت اور بازاریت سے پاک دیکھنے کے متمنی ہیں۔ ان کا ادب کا تصور صالح ہے اور وہ روایتی، اخلاقی اور الہامی طرز احساس کے نقاد ہیں۔ ان کے یہاں آفاقی شاعری کا تصور اسلامی و اخلاقی تصور سے الگ کوئی چیز نہیں، البتہ وہ پہلے ادب دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کا طرز استدلال وانشا دینی ہے۔ بعض اوقات وہ بے آمیز تعریف وتوصیف پر بھی اتر آتے ہیں لیکن اکثر اوقات توازن اور صاف گوئی سے کام لیتے ہیں، انہوں نے مستقل ادبی وتنقیدی مقالات بھی لکھے ہیں، تبصرے بھی کیے ہیں، تقریظیں بھی لکھی ہیں اور پی ایچ ڈی کے بعض مقالات پر رپورٹیں بھی لکھی ہیں مگر وہ جہاں فن پارے یا نقد وانتقاد کے محاسن کو جلوہ گر کرتے ہیں وہاں اس کے معائب سے بھی صرف نظر نہیں کرتے''۔

(عبدالماجد دریابادی- احوال وآثار ص ۱۱۸، ۱۱۹، طبع دوم ۲۰۰۶ء)

اخذ واقتباس کے ان مختلف نمونوں سے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے مجد علمی اور انشائے ماجدی کا پوری طرح اظہار تو ہوتا ہی ہے ساتھ ہی ساتھ ادب وتنقید میں ان کا درجہ ومرتبہ بھی معلوم ہوتا ہے۔



ماہ وسال

استقبالِ رمضان

مفتی محمد راشد ڈسکوی
دارالافتاء جامع مسجد اشتیاق، ڈسکہ

ان شاء اللہ چند روز میں رمضان المبارک کا مہینہ شروع ہونے والا ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے عظمتوں اور برکتوں والا مہینہ بنایا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ گیارہ ماہ انسان دنیا کے دھندوں اور مال کمانے کے چکر میں لگا رہتا ہے، جس سے اس کے دل پر غفلت کے پردے پڑ جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے یہ مہینہ عطا کیا ہے تا کہ انسان اس غفلت کو دور کر کے اپنی پیدائش کے اصلی مقصد (وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ) ترجمہ: "میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے" کی طرف متوجہ ہو جائے۔

ملک عزیز پاکستان، بلکہ پوری دنیا پر چھائے ہوئے خوف کے اثرات، معیشت و معاشرت کے تنگی والے حالات کی وجہ سے اس ماہِ مبارک میں اور زیادہ اس کی ضرورت ہے کہ ہم میں رجوع الی اللہ کی کیفیت بھر پور طریقے سے پیدا ہو، ہم اللہ کے ساتھ اپنے تعلق کو مزید مضبوط کریں، اس کے سامنے عاجزی و آہ وزاری کرتے ہوئے اسے منانے اور راضی کرنے کی جستجو میں لگیں، تا کہ اس کا غصہ ٹھنڈا ہو، اور وہ ہمیں مزید آزمائش سے محفوظ رکھے۔

استقبالِ رمضان کا طریقہ: رمضان المبارک کا اصل استقبال یہ ہے کہ اپنی مصروفیات کو کم سے کم کر لیا جائے اور اپنے آپ کو عبادت کے لیے فارغ کر لیا جائے۔ ان اوقات کو رمضان المبارک کے قیمتی بنانے میں اس طرح استعمال کریں کہ اللہ تعالیٰ راضی ہو جائیں اور ہمیں اپنے مہمان خانے

جنت الفردوس میں یقینی داخل کرنے کا فیصلہ فرمالیں۔اور ہمارا یہ ماہ مبارک اچھے سے اچھا بن جائے اس کے لیے چند باتیں کی خصوصی طور پر رعایت کرنا ہوگی جو ذیل میں ذکر کی جارہی ہیں:

☆......اس مہینہ میں روزہ کے مقصدِ اصلی ''تقویٰ'' اختیار کرنے کا پکا عزم کیا جائے، اور ابھی سے اپنے تمام گناہوں سے سچے دل سے توبہ واستغفار کیا جائے۔اور یہ عہد کیا جائے کہ یہ پورا مہینہ بالخصوص اور اس کے بعد کی جتنی بھی زندگی باقی ہے بالعموم گناہوں سے بچتے ہوئے گزاروں گا۔

☆......چونکہ رمضان المبارک کا مہینہ بے حد عزتوں اور عظمتوں والا ہے، اس لیے اس کی عظمت اور قدر ومنزلت کا احساس دل ودماغ میں بٹھالینا چاہیے، تاکہ اس ماہ کے آنے پر ہم میں غفلت، سستی اور بے توجہی نہ ہو، ایسا نہ ہو کہ یہ قیمتی دولت ہاتھوں سے نکل جائے اور ہم ہاتھ ملتے رہ جائیں۔

☆......حلال رزق کے حصول کا اہتمام اس طریقے سے کیا جائے کہ ہماری کمائی میں حرام کا ایک پیسہ بھی شامل نہ ہونے پائے، یاد رکھیں کہ اگر ایسا نہ ہوا، یعنی: دن بھر روزہ رکھ کر بھوک وپیاس کی مشقت کو برداشت کیا اور رات میں حرام مال سے افطار کیا تو اس نے احادیث مبارکہ کی روشنی میں اپنے روزے کے اجر کو بالکل ضائع کردیا: سیدنا ابوہریرہ ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ایسے بندے کے بھوکا پیاسا رہنے کی اللہ کو کوئی ضرورت نہیں (صحیح البخاری: ۱۹۰۳) لہٰذا بالخصوص اس ایک مہینہ میں اور بالعموم سارا سال ہی حرام روزی سے ضرور بچنے کی ترتیب بنائی جائے، چنانچہ جن لوگوں کا ذریعہ آمدنی بالکل حرام ہے، جیسے: سودی اداروں (بینک، انشورنس وغیرہ) میں ملازمت کرنے والے، انہیں چاہیے کہ وہ کوئی اور حلال ذریعہ معاش تلاش کریں یا کم ازکم اس ایک مہینہ کے لیے کسی سے کچھ رقم قرض لے لیں جس سے رمضان کی ضروریات پوری کریں اور آئندہ کے لیے پکا عزم کرلیں کہ میں ضرور حلال ذریعہ آمدنی تلاش کروں گا۔

☆......قرآن کریم کو تجوید کے ساتھ پڑھنے اور سیکھنے کا اہتمام کیا جائے، جس کے لیے ابھی سے کسی اچھے قاری یا حافظ صاحب کا انتخاب کرکے ان سے سیکھنے کی ترتیب بنائی جائے۔

☆......گھروں میں جتنی بھی خرافات والی چیزیں (ٹی وی، ڈش، کیبل وغیرہ) آلاتِ معصیت ہیں، ان سب کو گھر سے نکال باہر کریں، یہ سب کچھ ہمیشہ کے لیے، ورنہ اس ایک مہینہ کے لیے تو ضرور

ہی بند کردیں، ٹی وی چینلوں پر رمضان نشریات وغیرہ دیکھنے میں وقت ضائع نہ کریں، یہ باطل کی سازش ہے کہ وہ ہمیں مسجد و مدرسہ کے پاکیزہ اور نورانی ماحول سے دور کرتے ہوئے معصیت، فحاشی و عریانی اور لہو ولعب کے ان شیطانی آلات سے منسلک کردے۔ اس کو سمجھیں اور اپنے آپ کو اس سے بچائیں۔ اس کے ساتھ ساتھ موبائل فون وغیرہ کا استعمال بھی ضرورت کے بقدر کرلیں، اور اپنے ان قیمتی اوقات کو قرآن کریم کی تلاوت، نوافل اور تسبیحات اور دینی کتب کے مطالعہ میں صرف کریں۔

☆......رمضان المبارک اور عید وغیرہ کے لیے ضروری خریداری اس ماہ مبارک کی آمد سے پہلے ہی مکمل کرلیں، تاکہ رمضان کے بابرکت لمحات بازار کی نحوستوں میں خرچ نہ ہوں۔

☆......کاروباری حضرات اپنے آپ کو کسی بھی شئے کی ذخیرہ اندوزی سے بچائیں، رزق و معاش کی تنگی کے ان موجودہ اَحوال میں اپنے مسلمان بھائیوں کی مجبوریوں سے فائدہ نہ اٹھاتے ہوئے اُن کی خیر خواہی اور آسانی کے لیے عام قیمت پر ہی چیزیں فروخت کریں، رمضان کی وجہ سے چیزوں کی قیمتوں میں اضافہ نہ کریں۔

☆......رمضان المبارک کی آمد سے پہلے ہی اپنے گھر کا مالی بجٹ مرتب کریں، جملہ اخراجات کی تفصیل لکھیں اور پھر اس میں جتنی کمی کرنا ممکن ہو کرلیں، اور پھر اپنے اعزہ واقارب اور اڑوس پڑوس میں بسنے والے سفید پوش مسلمان بھائیوں کی مدد کریں۔

☆......عورتوں کو چاہیے کہ گھر کے جملہ امور جو رمضان المبارک سے پہلے سرانجام دینا ممکن ہوں انہیں ابھی نمٹا دیں تاکہ رمضان میں زیادہ سے زیادہ عبادت کے لیے فرصت کے لمحات میسر آسکیں۔

☆......ایک بڑی فضیلت جو ہم اکثر مساجد میں تبلیغی جماعت والوں کے حلقہ تعلیم میں سنتے رہتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص چالیس دن اخلاص کے ساتھ ایسے طریقے سے نماز پڑھے کہ اس کی تکبیر اُولی فوت نہ تو اُسے دو پروانے ملتے ہیں، ایک نفاق سے بری ہونے کا اور دوسرا جہنم سے چھٹکارے کا''۔ (سنن الترمذی: ۲۴۱)۔

اس کے پورا کرنے کا آسان موقع ہم کو میسر ہو رہا ہے، جتنے دن باقی ہیں، تیس دن رمضان کے اور چند دن اس کے بعد کے، ہمت کرکے اس بار یہ چلہ پورا کرلیا جائے تو کیا ہی کہنے۔ درپردہ اس

حدیث مبارکہ میں ایمان پر خاتمے کی بشارت ہے، کیا ہی اچھا ہو کہ اس بار ہم اس رمضان المبارک کو اس طرح بھی قیمتی بنالیں۔

☆......ابھی سے فضائل رمضان (مؤلف حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ) کا مکمل مطالعہ بھی کرلیں اور اپنے اہلِ خانہ سے اس کا مذاکرہ بھی کرلیں، اور اس کے ساتھ ساتھ مسائل رمضان بھی جان لیں، کیونکہ جس طرح روزہ رکھنا فرض ہے، اسی طرح اس روزہ کو فاسد ہونے سے بچانے کا علم حاصل کرنا بھی فرض ہے۔

☆......ایک بہت ہی زیادہ اہم کام یہ ہے کہ اپنے آپ کو ان گناہوں سے دور کرنا ہے جن کی وجہ سے اس عظیم الشان رحمتوں، برکتوں اور مغفرتوں والے مہینے میں بھی مغفرت نہیں ہوتی، اور وہ چار گناہ ہیں: ۱......: والدین کی نافرمانی، ۲......: قطع تعلقی، ۳......: دلوں کا کینہ و بغض، ۴......: شراب کا پینا، ابھی سے اپنے اپنے گریبان میں منہ ڈالیں اور دیکھیں کہ کہیں ان بیماریوں میں سے کوئی بیماری میرے اندر تو موجود نہیں، اگر ہے تو خدارا اپنے آپ کو اس سے نکال لیں۔

اور اگر اپنے کسی عزیز یا دوست کے اندر ایسی کسی بیماری پائے جانے کا علم ہو تو اس کے سامنے بھی ہاتھ جوڑیں کہ وہ بھی ان گناہوں سے نکل آئے، یقیناً ہمارا یہ فعل اس کے اوپر بہت بڑا احسان ہوگا۔

☆......رمضان المبارک میں غربا پر خرچ کرنے کے لیے اصحاب ثروت کو ترغیب دے کر اس طرف متوجہ کریں، ان کے ذمہ یہ کام ہو کہ محلے بھر میں ایسے سفید پوش ضرورت مند، مستحقین جو دوسرے کے سامنے اپنا ہاتھ نہیں پھیلاتے، کی تلاش کر کے ان کی فہرست بنالیں، اور پھر ان کے گھر مہینے بھر کا راشن رمضان شروع ہونے سے قبل ہی یا زیادہ سے زیادہ پہلے روزے کو ہی پہنچا دیں، ایسے افراد بسہولت روزے رکھیں گے تو ان کے روزے رکھنے کا اجر بھی ان خرچ کرنے والوں کو ملے گا، اور ساتھ ساتھ غربا کے اوپر خرچ کرنے کے فضائل بھی حاصل ہوں گی۔

☆......انتیسویں (۲۹) شعبان کو سورج غروب ہونے کے بعد چاند دیکھنے کا اہتمام کیا جائے کیوں کہ چاند کی تاریخ یاد رکھنا فرضِ کفایہ ہے اور خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رمضان المبارک کے اہتمام کی وجہ سے شعبان کا چاند دیکھنے اور اس کی تاریخیں یاد رکھنے کا خاص اہتمام فرماتے تھے۔

اردو ادب

اردو صحافت کے دو سو سال

مولانا محمد قمر الزماں ندوی

سلیقہ سے ہواؤں میں جو خوشبو گھول سکتے ہیں
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جو اردو بول سکتے ہیں

۲۷/ مارچ ۲۰۲۲ء کو اردو صحافت کے دو سو سال پورے ہونے پر ہر جگہ تقریبات صدی منعقد کی گئی، آج سے دو سو سال پہلے ۲۷ مارچ ۱۸۲۲ء کو شہر نشاط کلکتہ سے اردو صحافت کا آغاز ہوا تھا، اسی روز ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک ملازم پنڈت ہری ہر دت نے پہلے اردو اخبار "جام جہاں نما" کی اشاعت شروع کی تھی، اس زمانے میں ملک عزیز پر سامراج یعنی انگریزوں کا تسلط تھا اور باشندگانِ ہند کی بنیادی آزادی چھین لی گئی تھی۔ اس وقت ملک کو آزاد کرانے میں سب سے اہم کردار اردو صحافت اور اردو شاعری نے ادا کیا، اردو صحافت کا آغاز تو کلکتہ سے ۱۸۲۲ ہوا، لیکن اس کا اصل بانکپن ۱۸۳۷ء میں "دہلی اردو اخبار" کی اشاعت کے ساتھ سامنے آیا، جو مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے دہلی سے جاری کیا تھا۔

اردو برصغیر ہندو پاک کی ہی زبان نہیں ہے، آج یہ بین الاقوامی زبان کی حیثیت سے متعارف ہے، یہ گنگا جمنی تہذیب کی شناخت اور علمبردار ہے، اس زبان کی چاشنی اور مٹھاس کے سبھی قائل ہیں، اردو نثر اور نظم میں ملک وملت کی تہذیب وثقافت کا بڑا سرمایہ محفوظ ہے لیکن افسوس کہ اردو زبان کے ذریعہ معاش حاصل کرنے والے خود اس زبان کے دشمن بنتے جارہے ہیں، اردو صحافت کے دو سو سال پورے ہونے پر ہمیں اپنا محاسبہ کرنا چاہیے اور اردو زبان کی حفاظت کس طرح ہم کر سکتے ہیں اس پر

غور وفکر کرنا ضروری ہے، اس سلسلہ میں چند گزارشات ذیل میں پیش کی جاتی ہیں:

کسی بھی قوم کے لیے زبان کا مسئلہ بہت اہم ہوتا ہے، اس کو سرسری انداز میں نہیں لینا چاہیے، بلکہ اس کی حفاظت اور فروغ کے لیے ہمہ جہت جہد وجہد اور کوشش کرتے رہنا چاہیے، زبان کسی بھی قوم کے وجود و بقا کی ضامن ہے، اور یہ اس کے تشخص اور تعارف کا بہترین ذریعہ ہے، جس قوم نے اپنی زبان کی حفاظت کرلی، اس نے گویا اپنے وجود و بقا کی گارنٹی اور ضمانت حاصل کرلی۔ اسرائیلی (لوگ) برسہا برس دنیا میں ذلیل وخوار بھٹکتے رہے، ایک طویل مدت تک اس کا نہ کوئی علاقہ رہا اور نہ خطہ اور نہ حکومت لیکن اس قوم نے اپنی زبان کا کبھی سودا نہیں کیا اور نہ ہی کسی زبان سے یہ متاثر ہوئے، اس نے ہیبرو (عبرانی) زبان اور اس کے رسم الخط کو باقی رکھا اور وہ اس کو مادری اور قومی زبان سمجھتے رہے، جس کا نتیجہ ہے کہ اس قوم کا آج وجود باقی ہے اور اس نے اپنا لوہا منوالیا ہے۔ وہ قوم جس کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر نہیں ہے، پوری دنیا کا ہیرو بنی ہوئی ہے۔

کہا جاتا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ اگر کسی قوم کے وجود کو مٹانا ہو اور اس کی ملی اور تہذیبی شناخت کو ختم کرنا ہو، تو اس کی زبان اور اس کے رسم الخط کو مٹادو، وہ قوم خود بخود مٹ جائے گی اور اس کی شناخت ختم ہوجائے گی۔

آج مسلمانوں کے خلاف بھی یہ سازش ہورہی ہے کہ ان کا رشتہ اردو سے کاٹ دیا جائے یا کم ازکم اردو کا رسم الخط بدل دیا جائے، تاکہ یہ زبان اپنی موت آپ مرجائے۔۔ اس کے لیے حکومت کے پاس جتنے حربے ہیں وہ سب استعمال کررہی ہے۔ موجودہ قومی تعلیمی پالیسی جو کئی سو صفحات پر مشتمل ہے، اس میں اردو کا تذکرہ تک نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو اشارہ وکنایہ میں ہے۔ اسی طرح نظامیہ مدارس کے حوالے سے بھی کوئی گفتگو نہیں آئی ہے، جو آج اردو کی بقا، حفاظت اور فروغ کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، اس لیے اردو زبان کی بقا وحفاظت کی کوشش ہمیں خود کرنی ہے، کیونکہ اس کی حفاظت سے ہمارا ایمان وعقیدہ محفوظ رہے گا، ہماری ملی قومی اور دینی شناخت کی حفاظت ہوگی، اس کے لیے ہم سب کو سر جوڑ کر بیٹھنا ہوگا اور اس کے لیے فکر مند ہونا ہوگا۔

برصغیر میں ہماری علمی وراثت فارسی کے بعد بہت حد تک اردو زبان میں محفوظ ہے، اس زبان کے

ذریعہ اسلام کی اشاعت بھی ہوئی ہے اور اس کی تعمیر وترقی اور آزادی میں بھی اردو زبان کا بڑا دخل رہا ہے، اس زبان نے دلوں کو جوڑنے اور سماج کو بہتر بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ زبان کسی ایک علاقہ اور خطہ کی نہیں ہے یا ایک مذہب والوں کی زبان نہیں ہے، بلکہ دنیا کے بہت سے ملکوں میں یہ زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ہندوستان کے بہت سے صوبوں میں اس کو دوسری زبان کی حیثیت حاصل ہے۔ اقوام متحدہ نے بھی بین الاقوامی زبان کی حیثیت سے اس کو تسلیم کیا ہے۔

اس زبان میں جو مٹھاس ہے اور چاشنی ہے، وہ عربی اور فارسی کے علاوہ کسی اور زبان میں نہیں پائی جاتی ہے۔ اردو کئی زبانوں کی زبان ہے، اس اعتبار سے بھی اس کی ایک الگ پہچان اور شناخت ہے لیکن افسوس کہ آج اردو زبان روبزوال ہے، اس میں بہت زیادہ گراوٹ آگئی ہے، اردو کی روٹی کھانے والے خود اس سے بے اعتنائی برت رہے ہیں اور اس کا جنازہ نکال رہے ہیں۔ جو بہت افسوس کی بات ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ یہ زبان زندہ رہے اور اس کے ذریعہ سے ہماری تہذیب اور شناخت باقی رہے اور ہمارے علمی ورثہ کی حفاظت ہو تو ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اردو کے تحفظ کے لیے اور اس کی حفاظت کے لیے بھر پور کوشش کریں اور اس زبان کو زندگی اور تابندگی بخشنے کے لیے وہ سب کچھ کریں، جو اس کے لیے ضروری ہے۔ انفرادی اور اجتماعی طور پر کیا کوششیں ہوسکتی ہیں ان میں سے چند باتیں ہم یہاں بیان کرتے ہیں:

☆......اردو کتابوں کے مطالعہ کا ہم سب اہتمام کریں، گھر والوں کو بھی اس کا پابند کریں۔

☆......گھر میں یا ہم جہاں کہیں رہیں اردو بولنے کا اہتمام کریں، بلکہ اردو زبان میں ہی گفتگو کریں اور گھر کے تمام افراد کو بھی اس کی تاکید کریں۔

☆......گھر میں اردو کتابوں کا بڑا ذخیرہ رکھیں جس کے مطالعہ سے دینی اور ادبی معلومات میں اضافہ ہو۔

☆......ہر گھر میں اردو کی لغات اور ڈکشنریاں ہوں۔ خاص طور پر فیروز اللغات، لغات کشوری، فرہنگ آصفیہ اور قومی لغات وغیرہ

☆......کم از ایک اردو روزنامہ اخبار یا ہفتہ واری اخبار یا ماہنامہ مجلہ ضرور جاری کرائیں اور اہتمام

سے اس کا سارے لوگ مطالعہ کریں۔

☆......اپنی دکانوں کے بورڈ اردو میں بھی لکھوائیں اور اس کی تشہیر کے لیے جو پمفلٹ شائع کریں، اس کو اردو میں بھی لکھوائیں۔

☆...... ہر بڑی آبادی میں اردو لائبریری کے قیام کی فکر کریں، کیونکہ اس سے پڑھنے لکھنے اور مطالعہ کا ماحول بنے گا۔

☆......جن محکموں میں اردو میں درخواست دی جاسکتی ہے، وہاں ہم ضرور اردو میں درخواست پیش کریں۔

☆......جو لوگ اردو کی خدمت کر رہے ہیں، مصنف ہوں یا مو،لف ادیب ہوں یا شاعر مترجم ہوں یا صحافی ہم ان کی مالی اعانت بھی کریں اور ان کو اسناد اور طمغوں سے بھی نوازیں تا کہ ان کی حوصلہ افزائی ہو اور وہ جی جان لگا کر اس کی خدمت میں مصروف رہیں۔۔

☆...... ہر گھر میں بچوں کے لیے بھی لائبریری قائم کریں جہاں ادب اطفال یعنی بچوں کے ادب پر جتنی کتابیں ہیں، ان کو ضرور اکھٹا کریں۔ مائل خیر آبادی، طالب ہاشمی، عقیدت اللہ قاسمی، شفیع نیر، حکیم سعید دہلوی اور ابو المجاہد زاہد بچوں کے مشہور ادیب ہیں۔ ان کی کتابوں کو خریدیں اور بچوں کو انہیں پڑھنے کا مکلف بنائیں۔

☆......اپنے بچوں کو حفظ اس وقت کرائیں جب ناظرہ کے ساتھ اردو ٹھوس ہو جائے۔ اس سے پہلے حفظ میں داخلہ نہ کرائیں۔ نیز اپنے بچوں اگر کونونٹ میں پڑھا رہے ہیں تو اس کے الگ سے ان کی اردو کی تعلیم کا بھرپور انتظام کریں اس کے لیے اتالیق رکھیں۔

امید کہ ان گزارشات پر عمل کرنے کی ہم سب بھرپور کوشش کریں گے، اور اس زبان کو زندہ و تابندہ رکھنے سعی پیہم کرتے رہیں گے۔

☆......☆......☆

اصلاحِ معاشرہ

ہر حال میں تسلیم و رضا

مولانا مقصود احمد ضیائی

آتش نمرود گر بھڑکی ہے کچھ پرواہ نہیں
وقت ہے شان براہیمیؑ ۔۔۔دکھانے کے لیے

دورِ حاضر میں اغیار کی طرف سے طرح طرح کی دل آزار پالیسیوں کی وجہ سے امت کے اندر مایوسی پائی جاتی ہے، ہر وہ شخص کہ جو قرآن مجید کا مطالعہ کرتا ہے بخوبی جانتا ہے کہ کسی مومن کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ حالات کے تھپیڑوں سے متاثر ہو کر ایک لمحہ کے لیے بھی مایوسی جیسے مہلک مرض کا شکار ہو، درحقیقت انہی حالات اور نشیب وفراز سے انسانی زندگی کی تعمیر ہوتی ہے۔

تاریخ انسانی کے مطالعہ سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جن حالات و مسائل سے آج کی دنیا کو واسطہ پڑا ہے، اس سے کہیں زیادہ امت مسلمہ مصائب و مشکلات کی شکار رہی ہے بلکہ پوری اسلامی تاریخ ایک اعتبار سے بحرانوں کی تاریخ رہی ہے چنانچہ ہر دور کے اہل حق کو یاد رکھنا ہوگا کہ انہیں جب بھی دین اسلام جیسی لازوال اور انمول نعمت مقدر ہوگی تو انہیں قانونِ فطرت کے مطابق اس کی قیمت چکانی پڑے گی کچھ ایسا ہی معاملہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ رہا ہے کہ محسنینِ امت پر غم کے ایسے پہاڑ توڑے گئے کہ جن پر زمین و آسمان بھی رو اٹھے مگر نہ ظالم ظلم سے باز آیا اور نہ ہی انبیاء کرام کی یہ مقدس جماعت اپنے مشن سے باز رہی اور نہ ہی مایوسی ان کے قریب سے بھی گذری۔

قدرت نے محسن انسانیت نبی آخر الزماں جناب محمد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی اپنے نظام کے مطابق

سخت سے سخت آلام ومصائب سے گذارا، ان حقائق کی روشنی میں آج کے مسلمانوں کو بھی اپنے آپ کو ڈھالنا ہوگا اور موازنہ کرنا ہوگا، لہٰذا پیش آمدہ حالات میں صبر واستقامت کے ساتھ ساتھ قرآن وسنت کے ساتھ وابستگی اختیار کر کے معرفتِ الٰہی حاصل کرنی ہوگی۔

جاننا چاہیے کہ راہِ حق ہمیشہ خاردار ہوتی ہے اور انہی خاردار راہوں پر چل کر انسان منزل مقصود تک پہنچتا ہے، موجودہ حالات میں اہلِ ایمان کو احکامِ خداوندی اور فرامین رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روشنی میں ہی سمجھنا ہوگا۔ ہر دور میں اہل ایمان کو آلام ومصائب سے گزرنے کے بعد ہی سربلندی وفتح نصیب ہوئی ہے، اللہ کو رب، اسلام کو دین حق اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبی آخرالزماں ماننے کے لوازم میں سے ہے کہ ہم اللہ کے احکام اس کی قضاء وقدر اور اچھی بری تقدیر پر راضی رہیں، جب ہم سیرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وقت بھی راضی برضا تھے جب میدان جنگ میں نکلنا پڑا، آپ اکیلے ایک طرف اور دوسری طرف پوری دنیا مقابلہ میں کھڑی تھی، اپنے لاؤلشکر، کیل کانٹوں اور عشرت کے سامانوں اور استکبار کے ساتھ آپ کے خلاف صف آراء تھی، جب آپ کے پیارے چچا اور پیاری بیوی سیدہ خدیجۃ الکبریٰؓ دونوں وفات پا رہے تھے، عام الحزن آ گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تکذیب اور ایذارسانی میں شدت آ گئی، اس وقت بھی راضی تھے۔ جب آپ کی عزت کو چوٹ پہنچائی گئی، آپ کو ساحر کذاب، کاہن، مجنوں اور شاعر کہا گیا، آپ کو اس پر بھی کوئی شکوہ نہ ہوا، جب مکہ سے آپ کو نکال دیا گیا جو آپ کو بے حد محبوب تھا، جہاں آپ کا لڑکپن اور آپ کی نوجوانی گذری تھی۔ ہجرت کے وقت آپ مڑ مڑ کر اس کی طرف دیکھتے اور آنسو جاری تھے اور فرما رہے تھے: "اے مکہ! تو زمین میں سب سے زیادہ مجھے پسند ہے، تیرے رہنے والے مجھے یہاں سے نہ نکالتے تو میں نہ نکلتا۔" جب آپ طائف گئے ان بدبختوں کو دعوتِ دین دی تو انہوں نے برا جواب دیا، پتھر پھینکے، آپ کے پیروں سے خون بہنے لگا لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم راضی برضا رہے، مکہ چھوڑ کر مدینہ جانا پڑا، آپ کا پیچھا کیا گیا، راستے بند کیے گیے، میدان احد میں آپ زخمی ہوئے، آپ کے دندانِ مبارک شہید ہوئے، پیارے چچا کا ظالمانہ قتل ہوا، بہت سے صحابہ شہید ہوئے اور

لشکر اسلام بظاہر شکست سے دوچار ہوا لیکن آپ کی شجاعت قابل دید تھی فرمایا کہ "لوگو! صفیں باندھو آؤ! اللہ کی حمد وثنا کریں۔" منافقین یہود اور مشرکین سب نے آپ کے خلاف گٹھ جوڑ کیا لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چٹان کی طرح اپنے موقف پر جمے رہے، اس کا بدلہ تھا کہ اللہ پاک نے فرمایا: "تیرا رب عنقریب ہی تجھ کو وہ دے گا۔ جس سے تم راضی ہو جاؤ گے۔"

تنگیاں آسانیوں کے لیے آیا کرتی ہیں، جاننا چاہیے کہ کبھی کبھی اللہ پاک نعمتوں سے اور بعض کو مصائب میں مبتلا کر کے آزماتا ہے۔ اولاد اور مال و دولت بدنصیبی کا سبب بھی بن سکتے ہیں جیسا کہ فرمانِ خداوندی کا مفہوم ہے کہ: آپ کے اموال واولاد دھوکہ میں نہ ڈالیں۔ کتنی ہی مصیبتیں فائدہ مند ہوتی ہیں، اس ذیل میں جب ہم ماضی کے روشن کرداروں پر نظر ڈالتے ہیں تو حوصلہ ملتا ہے کہ ابن الاثیرؒ نے اپنی شاہکار کتابیں: "جامع الاصول" اور "النهايه" اسی وجہ سے لکھیں کہ وہ چلنے پھرنے سے معذور تھے، امام سرخسیؒ نے اپنی کتاب "المبسوط" کی پندرہ جلدیں اس وقت لکھیں جب ان کو کنویں میں بند کر دیا گیا تھا، ابن القیمؒ نے "زادالمعاد" بند کمرے میں لکھی، علامہ قرطبیؒ نے "مسلم" کی شرح کشتی کے اوپر لکھی، ابن تیمیہؒ کے تمام "فتاویٰ" اسیری کی حالت میں لکھے گئے۔ محدثین نے ہزاروں لاکھوں احادیث اکھٹی کیں کیوں کہ وہ فقیر اور اجنبی تھے، ابوالعلاء المعریؒ نے اندھا ہونے کے باوجود اپنی کتاب اور دواوین لکھے طٰہٰ حسین بھی نابینا تھے، اسی حال میں انہوں نے مشہور کتابیں اور ڈائری لکھی، غرض کہ کتنے ہی بلند عہدوں والے اپنے منصب سے معزول کر دیئے گئے تو انہوں نے علم کے میدان میں امت کی وہ خدمت کی جو عہدے پر رہ کر نہیں کر سکے۔

مصائب وآلام سے کون سا دور خالی رہا ہے، جاننا چاہیے کہ مشقتیں اور شدائد دل کو مضبوط کرتے ہیں، گناہوں کو دھوتے اور غرور کا خاتمہ کرتے ہیں، شدائد سے غفلت دور ہوتی ہے، یاددہانی حاصل ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اللہ واحد وقہار کے سامنے خودسپردگی کا جذبہ بڑھتا ہے، نصیحت ملتی ہے، صبر سے عاجزی پیدا ہوتی ہے، حزن وقلق نفسیاتی امراض کی جڑ ہیں، یہ عصبی آلام کا سرچشمہ ہیں اور اضطراب وسوسوں اور زوال کی نشانی ہے، فرصت معصیت کا دروازہ ہے، خالی اور بیکار رہ کر رنج وبلا

کے شکار نہ بنیں، نماز پڑھیں، قرآن مجید کی تلاوت کریں، تسبیح پڑھیں مطالعہ کریں، غور وفکر کریں، لکھیں اور دعائیں کریں، اللہ رب العزت کو یاد کریں ارشاد خداوندی ہے: ”مجھے پکارو میں تمہاری سنوں گا۔“

الحاصل مستقبل اسلام کا ہے، اس لیے کہ دین اسلام حق وصداقت کا علمبردار ہے، انصاف کا طرفدار ہے، اقتدار پر براجمان ہوکر پھٹی پرانی چٹائی پر بیٹھ کر انصاف کی عدالت کی مثال تو صرف اسلام ہی نے پیش کی ہے، جس کی ایک اہم ترین مثال فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت ہے، آپ کی زندگی کے بہت سے پہلو ہیں اور ہر پہلو دوسرے سے زیادہ اہم روشن اور قابلِ رشک ہے، خوفِ خدا اور فکرِ آخرت، حب الٰہی وحب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اتباعِ سنت، جرأت اور بہادری، حمیت دینی اور غیرتِ اسلامی، غریب پروری اور انسانیت نوازی، قوتِ فیصلہ اور نظم وضبط، اجتہاد اور استنباطِ مسائل جیسے سینکڑوں عنوانات ہیں جو سیرت فاروقی رضی اللہ عنہ کے صفحات پر جگمگا رہے ہیں اور تاریخ کا دامن حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسی جامع الصفات ہستی کی مثال پیش کرنے سے یقینا خالی ہے، چنانچہ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی زندگی کا اہم ترین باب، آپ کا اندازِ حکمرانی ہے، مشہور مفسر اور مستند مورخ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی مایہ ناز کتاب ”البدیه و النهایه“ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے انداز حکمرانی کو نہایت خوبصورت انداز میں پیش فرمایا ہے، ہر مومن کو چاہیے کہ وہ اس کا مطالعہ کرے، فاروق اعظم رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ: ”اگر دریائے فرات کے کنارے ایک کتا بھی پیاسا مر گیا تو اس کے لیے بھی میں جوابدہ ہوں“ کہ آپ کی خلافت میں ایک جانور کو رزق نہیں ملا اور آج بھی ملت حالات سے دوچار ہوتی ہے تو بچوں، جوانوں بوڑھوں مردوں اور عورتوں کو کیسے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے، کچرے اور ذلتیں ان پر ڈال دی جاتی ہیں، نجانے کیا کیا تماشے ہوتے ہیں، ایسے ایسے انسانیت سوز مظالم ڈھائے جاتے ہیں کہ جنہیں دیکھ کر کلیجہ منہ کو آجاتا ہے، سیدھی بات یہ کہ ایسے حکمرانوں پر بات کرنا بھی منہ کو خراب کرنا ہے، رب تعالیٰ ایسے لوگوں کی متعصّبانہ اور خودغرضانہ سیاست اور گندی چالوں سے انسانیت کو محفوظ رکھے، جن کو حلال وحرام کی تمیز نہیں ہے جو ملت کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہیں اور جب وضاحت طلب

کی جائے تو تاویلات کرتے پھرتے ہیں یہ تو ایسے ہی ہوا جیسے کوئی غلاظت کھائے اور یہ کہے کہ بڑی میٹھی ہے، کھائی تو غلاظت ہی ہے، بہر حال غلاظت خور ہے۔ اللہ عزوجل ایسے چالبازوں اور دھوکہ بازوں اور کذابین سے امت کی حفاظت فرمائے، مومنین اور مخلصین کو اقتدار اعلیٰ نصیب کرے، غرض کہ شاگردان محمد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ امتیازی پہچان ہے کہ انہوں نے اپنے کردار و عمل سے انسانیت کا معیار قائم کر دیا جو کہا اور سنا، اس پر عمل کر کے دکھایا، وہ جھوٹی نمود و نمائش سے کوسوں دور، اپنے استاذ کامل کے فقر و غنا اور سادگی کے عملی ترجمان تھے، وہ نفس کے محکوم نہ تھے بلکہ نفس ان کا محکوم تھا چنانچہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات اور برحق دین ہے، انسان کا اس سے محروم رہنا، مقصد زندگی سے محروم رہنا ہے، اسلام سلامتی کا مذہب ہے جو مساوات کا درس دیتا ہے، بطورِ خاص اغیار کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی جان و مال کی حفاظت کی وصیت اسلام کا وہ عالی وصف ہے جس نے چہار دانگ عالم میں اس کی کرنوں کو پہنچایا ہے، درحقیقت اہلِ اسلام سے خطا ہوگئی ہے، اہل اسلام نے نہ خود اسلام کے رہنما اصولوں سے مطلوب طور پر استفادہ کیا ہے اور نہ ہی بے قرار اور محتاج انسانیت کو اس گنج گراں مایہ سے روشناس کرایا ہے، ورنہ قدرت نے قرآن و حدیث، کلمہ توحید، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور اخلاق وغیرہ ایسی قیمتی اور عظیم الشان نعمتیں عطا کی ہیں کہ جن سے پیار کیے بغیر دنیا رہ نہیں سکتی، اہل ایمان سے خطا ہوگئی ہے، ہمارا کردار و عمل رکاوٹ بنا ہوا ہے، یہ وقت چھٹائی کا وقت ہے، ہمیں اس وقت باب اسلام پر کھڑے ہو کر رکاوٹ بننے کے بجائے ایک مثالی داعی کا کردار ادا کرنا ہے:

تو سمجھتا ہے حوادث ہیں، ستانے کے لیے — یہ ہوا کرتے ہیں ظاہر، آزمانے کے لیے
تندیِ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب! — یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے
کام یابی تو ہوا کرتی ہے ناکامیِ دلیل — رنج آتے ہیں تجھے راحت دلانے کے لیے
نیم جاں ہے کس لیے حالِ خلافت دیکھ کر — ڈھونڈ لے کوئی دوا اس کو بچانے کے لیے
استقامت سے اٹھا وہ نالۂ آہ و فغاں — جو کہ کافی ہو درِ لندن ہلانے کے لیے
آتشِ نمرود گر بھڑکی ہے کچھ پروا نہیں — وقت ہے شانِ براہیمی دکھانے کے لیے

کتب نما

خطباتِ عزیزی

[ماہنامہ النخیل میں کتابوں پر تبصروں کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے، تبصرے کے لیے دو کتابیں "ادارہ تراث الادب" کے پتے پر بھیجی جائیں۔ادارہ]

نام کتاب	:	خطباتِ عزیزی (۷ جلدیں)
مصنف	:	مولانا عزیز الرحمٰن ہزاروی
ملنے کا پتا	:	مکتبۃ الارشاد، ملیر ہالٹ، کراچی (0333-3730428)
مبصر	:	محمد بشارت نواز

مولانا عزیز الرحمٰن ہزاروی (پ: ۱۹۶۲ء) جامعہ بنوریہ عالمیہ، سائٹ کراچی کے شیخ الحدیث اور جامع مسجد قباء میٹروول، کراچی کے خطیب ہیں۔آپ کا آبائی وطن بٹگرام (خیبر پختونخوا) ہے، مانسہرہ سے تعلیمی سفر شروع ہوا، گوجرنوالہ میں درسِ نظامی کے ابتدائی درجات کی تعلیم حاصل کی، جہاں آپ نے امام اہلسنت مولانا سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ سے بھی کسبِ فیض پایا، بعدازاں آپ ہری پور اور پھر کراچی تشریف لے آئے۔ ۱۹۸۰ء میں جامعہ علوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی سے فراغت ہوئی۔آپ ابتدا ہی سے ذی استعداد اور لیاقت کے حامل تھے، ہر امتحان میں نمایاں کامیابی آپ کا مقدر رہی، یہاں تک کہ دورہ حدیث کے سال بھی جامعہ کے امتحان میں اول جبکہ وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے سالانہ امتحان میں ملک بھر میں چوتھی پوزیشن حاصل کی۔سندِ فراغت کے حصول کے فوراً بعد ہی آپ تدریس کے شعبے سے منسلک ہو گئے، مختلف مدارس میں تدریس کے بعد ۱۹۹۴ء میں جامعہ بنوریہ عالمیہ میں تدریس کے لیے تقرر ہوا جو تا حال جاری ہے، آپ جامعہ میں شیخ الحدیث

کے منصب پر فائز ہیں، اسی کے ساتھ آپ ۱۹۹۵ء سے جامع مسجدِ قباء، میٹروول، کراچی میں خطابت کے فرائض بھی سرانجام دے رہے ہیں، اس سے قبل آپ ایک سال دعوت وتبلیغ کی غرض سے تبلیغی جماعت کے ساتھ بھی سفر کر چکے ہیں، اس وقت آپ کا شمار کراچی کے بڑے علماء میں ہوتا ہے۔

آپ صاحبِ مطالعہ شخصیت اور تحقیقی مزاج کے حامل بہترین مدرس ہیں، اسی کے ساتھ دھیمے لہجے میں مؤثر طرزِ خطابت کے حامل عمدہ خطیب اور سوزِ دل رکھنے والے حقیقی واعظ بھی ہیں، جامعہ بنوریہ میں پندرہ روزہ اصلاحی وتربیتی نشست میں سال ہا سال سے وعظ کے علاوہ دیگر مساجد میں درسِ قرآن بھی دیتے ہیں۔ جس سے استفادہ کی غرض سے لوگ بڑی تعداد میں شریک ہوتے ہیں۔

آپ کے بیانات کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ آپ کا ہر بیان بھرپور مطالعہ کے بعد اور مستقل محنت کے ساتھ تیار کیا گیا ہوتا ہے۔ جس میں سطحی گفتگو نہ ہی کوئی بات فائدے سے خالی ہوتی ہے۔

"خطباتِ عزیزی" سات جلدوں میں آپ کے جمعہ کے منتخب علمی، اصلاحی اور تربیتی بیانات کا مجموعہ ہے، اس سے قبل آپ کے چند بیانات ایک جلد میں شائع ہوئے اور طلباء وعلماء میں بے حد پسند کیے گئے، زیرِ تبصرہ "خطباتِ عزیزی" جسے مکتبۃ الارشاد، ملیر ہالٹ کراچی نے سات جلدوں میں شائع کیا ہے، یہ اس کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ جسے عمدہ کاغذ اور بہترین طباعت کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔

مولانا عزیز الرحمٰن ہزاروی صاحب خطیب ہونے کے ساتھ ایک محقق مدرس بھی ہیں، بلکہ آپ کا اصل تعارف ایک مدرس ہی کا ہے، اس لیے آپ کے بیانات غیر مستند روایات اور من گھڑت واقعات سے خالی ہیں، آپ کے بیانات میں اعمال وافعال کی اصلاح کے علاوہ باطل عقائد وافکار اور بدعات و رسومات کے عقلی ونقلی رد پر گفتگو بھی ہوتی ہے، جو سننے والوں کے لیے بے حد مفید ثابت ہوتی ہے۔

اس کی پہلی جلد ۲۰، دوسری جلد ۱۹، تیسری جلد ۱۹، چوتھی جلد ۲۱، پانچویں جلد ۲۰، چھٹی جلد ۲۰ اور ساتویں جلد ۲۹ خطبات پر مشتمل ہے، اس طرح یہ خطبات کل ۱۴۸ منتخب بیانات کا مجموعہ ہے۔ جنہیں آپ کے چند تلامذہ نے مرتب کیا اور تصحیح وتخریج کے ساتھ اسے مزید بہتر بنایا ہے۔ لفظی غلطیوں کی تصحیح کا بھی خوب خیال کیا گیا ہے، یہاں تک کہ اردو رسم الخط کے جدید قواعد کا لحاظ بھی کیا گیا ہے۔

خطباتِ عزیزی کی ہر جلد میں قریب قریب ایک جیسے موضوعات کے بیانات جمع کر دیئے گئے ہیں، مثلاً پہلی جلد میں سیرت امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، درود شریف بہترین ہدیہ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاقِ عظیمہ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت میں خدمتِ خلق، اتباعِ سنت میں کامیابی ہے، واقعہ معراج توہینِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی سزا وغیرہم سیرت کے عنوان سے بیانات جمع کیے گئے ہیں۔

دوسری جلد میں عالم غیب صرف اللہ کی ذات ہے، وحدانیت باری تعالیٰ، تقدیر پر ایمان لانا واجب ہے، مرتبہ علم و علماء، علم کی حقیقت، شبِ قدر اور قرآن کریم کا نزول، روزے کا مقصد تقویٰ وغیرہم عقائد، فضائلِ قرآن و رمضان، نماز و زکوٰۃ کے عنوان سے بیانات جمع کیے گئے ہیں۔

تیسری جلد میں شانِ صدیق اکبرؓ، مناقبِ عمر فاروقؓ، شانِ عثمان بن عفانؓ، مقامِ علی المرتضیٰؓ، شانِ علی المرتضیٰؓ، عظمتِ صحابہ کرام، شیعہ مذاہب کی حقیقت، جنگِ جمل اور واقعہ کربلا، منکراتِ محرم، اصحابِ کہف کا واقعہ، گواہانِ نبوت وغیرہم اہم عنوانات کے بیانات جمع کیے گئے ہیں۔

چوتھی اور پانچویں جلد میں جھگڑوں کا بہترین حل، بدگمانی اور اس کے نقصانات، بدنظری گناہ کی پہلی سیڑھی، عذابِ قبر اور اس کے اسباب، ابلیس کے جال، غصہ پی جانے والے اعمال، حسد اور اس کی شناعتوں کا بیان، رزقِ حلال اور اس کے فوائد، کامیابی کے دو اصول، ذکر اللہ حصولِ راحت کا ذریعہ، پڑوسی کے حقوق وغیرہم اصلاحی عنوانات کے بیانات جمع کیے گئے ہیں۔

چھٹی اور ساتویں جلد میں اختتام بخاری شریف، اذان کی اہمیت، جمعۃ الوداع، قوم پرستی اور عصبیت کی لعنت، دفع مشکلات کا اکسیر نسخہ، اولاد کی تربیت اور ہمارا معاشرہ، معیارِ عقل مندی، رجب کی بدعات، عورت مارچ بے حیائی کا فروغ وغیرہم متفرق عنوانات کے بیانات جمع کیے گئے ہیں۔

خطباتِ عزیزی علماء و طلباء خصوصاً ائمہ مساجد و خطباء کے لیے بہترین تحفہ ہے، جس میں ہر طرح کے موضوعات پر عام فہم زبان میں علمی، تحقیقی و اصلاحی مفید بیانات ترتیب دے دیئے گئے ہیں۔ طباعت کے لحاظ سے قیمت بھی مناسب مقرر کی گئی ہے۔

☆......☆......☆

مسافرانِ آخرت

مفتی محمود اشرف عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

جامعہ دارالعلوم کراچی کے مایہ ناز استاذ حضرت مفتی محمود اشرف عثمانی رحمۃ اللہ علیہ طویل علالت کے بعد ۲۵ رجب المرجب ۱۴۴۳ھ بمطابق ۲۷ فروری ۲۰۲۲ء کو ۷۳ برس کی عمر میں انتقال فرما گئے۔ آپ کا شمار دارالعلوم کراچی کے اکابر میں ہوتا تھا۔آپ کی پیدائش ۰۸ شعبان ۱۳۷۰ھ بمطابق ۱۴ مئی ۱۹۵۱ء کو برعظیم کے ایک نامور علمی خانوادے میں ہوئی، آپ کے والدِ ماجد محترم محمد زکی کیفی مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع عثمانیؒ کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے۔

مفتی محمود اشرف عثمانیؒ نے درسِ نظامی کی تعلیم جامعہ اشرفیہ، لاہور سے حاصل کی ،۱۹۷۰ء میں سندِ فراغت حاصل کرنے کے بعد دارالعلوم کراچی میں داخل ہوئے اور تخصص فی الافتاء کی سند حاصل کی، ۱۹۷۳ء تا ۱۹۷۴ء جامعہ اشرفیہ، لاہور میں تدریس کے بعد آپ مزید تعلیم کے لیے جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔، جہاں عرب علماء کے علاوہ ہندو پاک کے اکابر سے بھی کسبِ فیض کا شرف حاصل ہوا، جن میں مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی کا نام سب سے نمایاں ہے۔

۱۴۱۱ھ بمطابق ۱۹۹۰ء میں آپ شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم کی دعوت پر دارالعلوم کراچی تشریف لے آئے اور تادمِ آخر دارلعلوم میں تدریس سے وابستہ رہے، جہاں بخاری شریف کی جلد ثانی تک کی کتابیں آپ کے زیرِ تدریس رہیں، دارالافتاء میں آپ کے تصحیح کردہ اور تحریری فتاویٰ کی تعداد ایک لاکھ سے زائد ہے۔ان کے علاوہ آپ کئی اہم کتابوں کے مصنف بھی تھے۔

آپ کی نمازِ جنازہ وفات کے روز ہی رات ساڑھے گیارہ بجے دارالعلوم کراچی میں شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی کی اقتداء میں ادا کی گئی اور وہیں آپ کی تدفین ہوئی۔

ناقابلِ فراموش تحریروں کا سدا بہار مجموعہ

یادگارِ زمانہ شخصیاتؒ کے احوالِ مطالعہؒ

(اکابر علماء کی نظر میں)

یہ معلوم ہوکر خوشی ہورہی ہے کہ محترم مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مجلہ النخیل کا ''مطالعہ نمبر'' شائع فرمارہے ہیں، جس میں برصغیر کے مشہور اہلِ قلم حضرات کے ذوقِ مطالعہ و کتب بینی اور انتخابِ کتب وغیرہ سے متعلق وقیع اور گراں قدر معلومات جمع کی گئی ہیں۔ مولانا محترم کی یہ کوشش لائقِ ستائش اور قابلِ قدر ہے۔ امید ہے کہ یہ خصوصی شمارہ ایک قیمتی دستاویز اور نئی نسل کیلئے مشعلِ راہ ثابت ہوگا۔

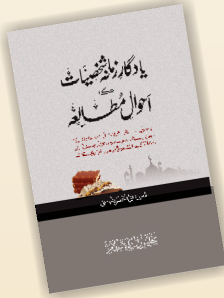
مفتی ابوالقاسم نعمانی
مہتمم دارالعلوم دیوبند

''النخیل'' کا ''مطالعہ نمبر'' متقاضی وقت بھی ہے اور ایک نہایت لائقِ قدر و ستائش کاوش بھی۔۔۔ راقم السطور بصمیم قلب بارگاہِ رب العزت میں دعا گو ہے کہ حق تعالیٰ آپ محترم اور جملہ شرکائے کار کی ان مخلصانہ جہود کو بارآور فرمائیں اور اس کے ثمر آور اور متوقع مثبت نتائج سے امت مسلمہ کو بالعموم اور نسل نو کو بہرہ ور فرمائیں، آمین یارب العالمین

مولانا محمد سفیان قاسمی
مہتمم دارالعلوم (وقف) دیوبند

مجھے یہ معلوم ہوکر نہایت مسرت ہوئی کہ آپ اپنے ماہ نامہ ''النخیل'' کا ''مطالعہ نمبر'' منظرِ عام پر لا رہے ہیں، امید ہے کہ آپ کے اس خصوصی دستاویزی اور عالمی ومعیاری شمارے سے علم و کتاب سے واسطہ و رابطہ رکھنے والوں کو مزید رہنمائی حاصل ہوگی۔

مولانا محمد سعیدی
ناظم مظاہر علوم (وقف) سہارنپور



''یادگارِ زمانہ علمی شخصیات کا احوالِ مطالعہ'' کے عنوان سے (یہ مجموعہ) شائع کرنے کی عمدہ کاوش کی ہے۔ امید ہے کہ ڈیجیٹل دنیا کے اس دور میں طلبہ کے لیے یہ علمی کاوش نہایت مفید ہوگی اور مطالعہ کے ختم ہوتے ذوق میں روح پھونکنے کا کام کرے گی۔ ان شاء اللہ۔۔۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے نامور و ماہر ادیب، صاحب قلم مولانا ابن الحسن عباسی اور ان کے رفیقِ خاص مولانا بشارت نواز اور دیگر رفقا کو کہ اس کام کو وقت کی ضرورت سمجھتے ہوئے انہوں نے کامیاب کوشش کی ہے۔

مولانا غلام محمد وستانوی
رئیس جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا

مطالعہ سے بیزاری کے ایسے عمومی ماحول میں علم ومطالعہ کی صدا یقیناً سناٹے میں آواز پیدا کرنے کے مترادف ہے۔ گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را کے مصداق بندہ آپ کی اس متوقع اشاعت کو جرسِ کارواں کے طور پر دیکھتا ہے اور دعا گو ہے کہ حق تعالیٰ شانہ ''النخیل'' کے ''مطالعہ نمبر'' کو قبولیتِ تامہ اور مقبولیتِ عامہ سے سرفراز فرمائے۔

مولانا خالد سیف اللہ گنگوہی نقشبندی
(مدیر) جامعہ اشرف العلوم رشیدی گنگوہ

عموماً میدانِ علم کے نو واردان مجھ سے سوال کرتے ہیں کہ وہ مطالعہ کیسے کریں؟ کیا مطالعہ کریں؟ مطالعہ کرنے کے بعد کچھ یاد نہیں رہتا، اسے ذہن نشین کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ مطالعہ کے بعد لکھنے کا آغاز کیسے کریں؟ تحریر کو مؤثر، شستہ اور رواں کیسے بنائیں؟ تصنیف و تالیف کی مشق کیسے کریں؟ وغیرہ۔ امید ہے، النخیل کی یہ خصوصی اشاعت ان کے ان تمام سوالات اور ان جیسے دیگر بہت سے سوالات کے جوابات فراہم کرے گی۔

ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی
سیکریٹری جماعت اسلامی ہند، نئی دہلی



مجلس تراث الاسلام، سلیم ہاؤسنگ سوسائٹی، شاہ فیصل ٹاؤن نمبر 3، کراچی
فون نمبر: 0300-4097744, 0344-4023470
ای میل: alnakhil786@gmail.com